15

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"بہادر یار جنگ شاہینوں کی نظر میں" نامی کتاب
جو 1976ء میں بہادر یار جنگ اکیڈمی
کراچی سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب سے
۲۲ مضامین شریک کتاب ہیں۔

بہادر یار جنگ

اہلِ نظر کی نظر میں

مرتبہ:۔ نذیر الدین احمد

سلسلۂ مطبوعات بہادر یار جنگ ۱۵

بہادر یار جنگ

اہلِ نظر کی نظر میں

(مرتبہ)

نذیر الدین احمد (عثمانیہ)
سابق کونسلر

ناشر
قائد ملّت اکیڈیمی چیلہ پورہ حیدرآباد
قیمت 4/-

طبع اول	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	مئی ۱۹۸۰ء
ناشر	قائد ملت اکیڈیمی چیلہ پورہ حیدرآباد اے پی
کتابت	محمد مظہر
مسودات ٹائپ	عبدالقادر مرحوم ٹائپسٹ
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پریس
سرورق ڈیزائن	ایم۔ اے۔ غفار آرٹسٹ
طباعت سرورق	انتخاب پریس
قیمت	چار روپے

(ملنے کے پتے)

سوپر سانک کاپینگ سنٹر دیوان دیوڑھی حیدرآباد

حسامی بک ڈپو مچھلی کمان۔ حیدرآباد

ایاس ٹریڈرس شاہ علی بنڈہ روڈ حیدرآباد

انتساب

میں اس کاوش کو حضرت قائد ملت کے عزیز اور شیدائی جناب ڈاکٹر محبوب علی خاں صاحب جی، بی، وی، سی (G.B.V.C) پٹنہ پی جی (یو، ایس، اے) (P.G (U.S.A سابق جائنٹ ڈائرکٹر انیمل اینڈ ہسبنڈری ڈیپارٹمنٹ حکومت آندھرا پردیش کے نام معنون کرتا ہوں۔

جو قائد کے پیام کو اہل درد سے متعارف کروانے کی جدوجہد میں پورے خلوص اور لگن کے ساتھ ابتداء سے آج تک شریک کار ہیں۔

ملت کی فلاح و بہبود کے ہر کام میں امکانی تعاون کے لیے یہ ہمیشہ آمادہ و تیار رہتے ہیں۔

اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ آمین

نذیر الدین احمد

آہ۔ عبدالقادر

یکم فروری ۱۹۸۰ء کو یہ دلخراش خبر ملی کہ جناب عبدالقادر صاحب ساکن اے سی گارڈ، ٹاپیسٹ محکمہ بلدیہ در دشکم کے بعد اچانک انتقال کر گئے۔

پچھلے بیس برس سے میرا عبدالقادر سے دلی تعلق و تعارف تھا، ہنس مکھ، ملنسار، شریف النفس، فرض شناس انسان ـــــ اور حضرت قائد ملت کے شیدائی تقریباً ۲۰ برس حضرت قائد ملت کے نگارشات سے متعلق مسودات کے ہزار ہا صفحات کو ٹائپ کرنے کا کام اس نیک نفس انسان نے بلا معاوضہ انجام دیا۔ عبدالقادر نے حضرت قائد ملت سے متعلق میرے کام میں میرے دست راست کی حیثیت سے میری مدد کی اور اس عظیم کام کو اپنی محنت سے میرے لیے آسان کر دیا۔ آہ ـــ وہ موت کی آغوش میں سو گیا ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میری دعا ہے کہ خدا عبدالقادر کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا ہو ـــــ آمین

نذیر الدین احمد

ابتدائیہ

قائد ملت اکیڈیمی (حیدرآباد) کی جانب سے حضرت قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کے انتقال کے ۲۶ برس بعد پہلی بار ایک منظم پروگرام اور منصوبے کے تحت قائد کے نقوش قلم و باقیات کی اشاعت کا سلسلہ "نگارشات بہادر یار جنگ" سے (۱۹۶۸ء) شروع کیا گیا اور اس سلسلے کی دس کتابیں ۱۹۷۱ء تک شائع ہوتی رہیں۔

لیکن بے قدری کا تقاضہ یہی تھا کہ اس سلسلۂ اشاعت کو روک دیا جائے۔

دسمبر ۱۹۷۸ء میں جب مولوی وحید الدین خاں صاحب بوزنی معتمد اعزازی بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی حیدرآباد تشریف لائے تو تعارف و تعلق جو نواب صاحب کی نسبت سے تھا وہ رنگ لایا، مداوائے الم کا علاج یہ طے پایا کہ جفا کی ظلمت نوازیوں میں وفا کی شمع جلائی جائے۔ یہ حوصلہ اس مرد قلندر سے ملا جو اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ ؎

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

اپریل ۱۹۷۹ء میں گیارھویں کتاب "بہادر یار جنگ مشاہیر وطن کی نظر میں" مئی ۱۹۷۹ء میں بارھویں کتاب "بہادر یار جنگ مشاہیر دکن کی نظر میں" اکتوبر ۱۹۷۹ء میں تیرھویں کتاب "بہادر یار جنگ اہل دانش کی نظر میں" اپریل ۱۹۸۰ء میں چودھویں کتاب "بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں" شائع ہوئی۔

زیر نظر کتاب "بہادر یار جنگ اہل نظر کی نظر میں" قائد ملت اکیڈیمی حیدرآباد کی پندرھویں کتاب ہے۔

بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی سے ابتداً "مکاتیب بہادر جنگ" دوسری کتاب "حیات بہادر یار جنگ" شائع ہوئی اور تیسری کتاب جون ۱۹۷۶ء میں "بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں" کے زیر عنوان منظر عام پر آئی۔ اس ضخیم کتاب میں مولوی وحید الدین خاں صاحب بوزنی نے تمام منتشر مضامین کو جو اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے اور ساتھ ہی ان مضامین کو بھی جو اہل دانش سے اس کتاب کے سلسلے میں لکھوائے گئے تھے یکجا کر کے شائع فرمایا۔

زیر نظر کتاب، اسی کتاب سے ماخوذ مضامین پر مشتمل ہے۔ جو بغرض استفادہ عوام شائع کی جا رہی ہے۔ اس طرح اس کتاب کی اشاعت میں میری حیثیت ناشر کی ہے، مرتب کی نہیں۔

اگر

قیمت زندگی ـــــــ زندگی کا لہو

ایک صداقت ہے تو

بدلا ہوا ہے آج میرے آنسوؤں کا رنگ

کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا

کے مصداق حال و احوال سے گزرنا پڑتا ہے چونکہ اس کام کی تکمیل میں جو دشواریاں ہیں اس کو صرف زخم دل کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ بہر حال بفضل تعالیٰ کام جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔

مئی سنہ ۱۹۸۰ء

نذیر الدین احمد

۷۲۳-۶-۲۱ چیلہ پورہ، حیدر آباد

آندھرا پردیش (انڈیا)

جناب سید عبدالواحد

ایک دلربا شخصیت

جب قائداعظم نے انگلستان سے لوٹ آنے اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ذمہ داری سنبھالنے کا فیصلہ کیا تو چند سربرآوردہ قومی کارکن ان کی قیادت میں کام کرنے کے لیے ان کے ساتھ ہو گئے ان کارکنوں میں نواب بہادر یار جنگ ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نواب صاحب کی اندوہناک اور ناوقت موت تک وہ قائداعظم کے معتمد الیہ اور دست راست رہے۔ نواب صاحب نے اپنے قائد کا اعتماد حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ مسلم عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی خاطر انھوں نے سارے ہندوستان کے دورے کیے اور اپنی بے مثال خطابت سے مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت بنانے کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ نواب صاحب بجا طور پر ان عظیم مجاہدین میں شمار کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے قائداعظم کی قیادت میں حصول پاکستان کی جنگ لڑی۔

بہادر یار جنگ پٹھانوں کے سدوزئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو بنی پٹھان کہلاتے ہیں۔ ان کے اجداد احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان

آئے اور ان کے جدِّ اعلیٰ محمد دولت خاں راجستھان کی ریاست جے پور میں رہ پڑے۔ محمد دولت خاں اور ان کے خاندان کی خدمات کے صلے میں جے پور کے راجہ نے انھیں جاگیر عطا کی۔ پھر یہ خاندان جے پور سے ریاست حیدرآباد چلا گیا اور یہاں بھی اس خاندان کو جاگیر عطا ہوئی۔

محمد بہادر خاں نواب بہادر یار جنگ فروری ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے چند ہی دن بعد ان کی والدہ وفات پا گئیں اور نواب صاحب کی نانی نے جو ایک نہایت سمجھدار اور مذہبی خاتون تھیں، ان کی پرورش کی۔ اٹھارہ سال کے ہوئے تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے وقت جاگیر قرضوں کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی۔ نواب صاحب نے غیر معمولی تدبّر اور انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور تھوڑی مدت میں قرضوں سے نجات حاصل کرلی۔ جاگیر کے حالات سنبھل گئے تو نواب صاحب نے حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ حج سے فارغ ہوکر مسلم ممالک کی سیاحت کی۔ حج اور سیاحت سے واپسی کے بعد انھوں نے خاکسار تحریک سے وابستگی اختیار کرلی اور ساتھ ہی ریاست کی ایک سیاسی مذہبی تنظیم مجلس اتحاد المسلمین میں بھی شامل ہوگئے۔ ۱۹۴۲ء میں خاکسار تحریک سے علیحدہ ہوگئے اور اپنی ساری توجہ مجلس اتحاد المسلمین کی طرف مرکوز کردی۔ خاکسار تحریک سے وابستگی کے دوران انھیں عسکری تنظیم کی اہمیت کا اندازہ ہوا، اور انھوں نے مجلس اتحاد المسلمین میں ایک رضاکار تنظیم قائم کی۔ نواب صاحب کی قائدانہ صلاحیتوں نے مسلمانانِ دکن میں ایک نیا قومی جذبہ پیدا کردیا۔

اُن ہی دنوں نواب صاحب کی توجہ ہندوستان کی ہندو ریاستوں

کے مسلم باشندوں کی زبوں حالی کی طرف مبذول ہوئی اور مسلمانوں کو ہندو والیان ریاست کے ظلم وستم سے بچانے کے لیے ریاستی مسلم لیگ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور ریاستی مسلم لیگ کے اجلاس بھی کل ہند مسلم لیگ کے اجلاسوں کے ساتھ ساتھ منعقد ہونے لگے۔

بہادر یار جنگ ایک دیسی ریاست کے شہری ہونے کی بناء پر کل ہند مسلم لیگ کے باضابطہ ممبر نہیں بن سکتے تھے مگر مسلم لیگ کے ہر سالانہ اجلاس میں ان کی تقریر ایک روایت بن گئی تھی۔ جب اجلاس کی باضابطہ کاروائی ختم ہو جاتی تو قائداعظم اُن کی تقریر کا اعلان کرتے اور ان کی خطابت انہیں مسلم لیگی زعماء کے صف اول میں لے آئی۔ قائداعظم اور نواب صاحب کے درمیان پہلی ہی ملاقات سے خلوص اور محبت کے رشتے قائم ہو گئے۔ پاکستان کا مطالبہ نواب صاحب کے لیے جزو ایمان بن چکا تھا، اور وہ اس مسئلے پر کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھے قائداعظم اُن کے خلوص اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مداح تھے تو نواب صاحب قائد اعظم کے مرید۔ مسلم لیگ کی مالی حیثیت بڑی ہی کمزور تھی اس لیے اکثر چندوں کی اپیل ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر بہادر یار جنگ کی خطابت کے جوہر کھلتے۔ ان کی ایک ہی تقریر کافی ہوتی اور چندہ جمع ہو جاتا۔ نواب صاحب کی مخلصانہ خدمات اور غیر معمولی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ قائداعظم ان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگے تھے۔

بہادر یار جنگ کی زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ اس راہ میں نہ کامیابیوں نے انہیں آپے سے باہر کیا اور نہ ناکامیوں نے پست ہمت۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ اور نفع و زیاں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہے۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس لاہور میں منعقد ہونے والا تھا ان دنوں نہ صرف لاہور بلکہ سارے پنجاب کے حالات دگرگوں تھے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر خضر حیات خاں اجلاس کی اجازت دینے میں پس و پیش کر رہے تھے اس وقت بہادر یار جنگ نے قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ حکومت پنجاب کو پرامن جلسے کی ضمانت دے دیں اور قائداعظم کو یقین دلایا کہ اجلاسوں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے گا۔ اور اب یہ بات سب ہی کو معلوم ہے کہ اجلاسوں میں وہی ہوا جو بہادر یار جنگ نے کہا تھا۔

بہادر یار جنگ بڑی ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ بڑے ہی مذہبی اور معاملات میں انتہائی صداقت پسند اور کھرے انسان تھے جس بات کو حق سمجھتے اس کو کہتے اور کر گزرنے میں کسی کی پروا نہ کرتے۔ وہ دامے، درمے، سخنے ہر ایک کی مدد کے لیے ہر وقت مستعد رہتے۔

نواب بہادر یار جنگ کی شخصیت اور کردار بنانے میں ان کی نانی اور ان کے اساتذہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس کے بعد قائداعظم اور علامہ اقبال نے ان پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ دونوں کے پرستار تھے۔ جب بمبئی میں ایک خاکسار نے قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کیا تو نواب صاحب کی تڑپ اور بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، وہ رات بھر قائداعظم کی سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے اور دوسرے دن پہلی ٹرین سے بمبئی روانہ ہو گئے۔ علامہ اقبال کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے مکان بیت الامت میں ہر ہفتے درس اقبال کی محفل منعقد کرتے تھے درس دینے والوں میں نواب صاحب کے علاوہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر غلام دستگیر رشید اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں جیسے اقبال شناس شامل ہوتے۔ درس اقبال

کا یہ سلسلہ نواب صاحب کی وفات کے بعد بھی بڑے عرصہ تک قائم رہا۔ اُن کی زندگی کے آخری دن بھی ان کے مکان پر یہ مجلس منعقد ہوئی تھی۔ وہ جب کلام اقبال کی شرح کرتے تو ان کی تقریر سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ انھیں گفتگو کا بڑا سلیقہ تھا۔ مگر جب وہ کلام اللہ کی تفسیر یا کلام اقبال کی شرح بیان کرتے تو اس گفتگو کا رنگ ہی اور ہوتا وہ جب بھی پاکستان اور مسلم لیگ پر بات کرتے تو بے اختیار دعا کرنے لگتے کہ "خداوندا! میری زندگی کے باقی دن قائداعظم کو عطا کر دے۔"

ان کی جرأت اور قیادت نے ایک کثیر جماعت کو ان کو پیرو بنا دیا تھا۔ سب کے دل خدمت اسلام کے جذبے سے سرشار ہو گئے تھے اور اس راہ میں انھوں نے اپنی دولت اور اپنا وقت حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی لٹا دی۔ زندگی میں وہ ریاست حیدرآباد کے بے تاج بادشاہ بن چکے تھے اور پھر ان کی موت تو شاید بادشاہوں کے لیے بھی قابل رشک تھی۔ لاکھوں انسان ان کی میت کے جلوس میں شریک تھے مسلمان، ہندو، پارسی، عیسائی غرض سارا دکن ماتم کناں نظر آتا تھا۔

دکن میں اپنی آمد کے بعد سے مسلمانوں نے بڑے بڑے لوگ پیدا کیے اور یہ بات وثوق سے کہی جاتی ہے کہ نواب بہادر یار جنگ ان میں سب سے بڑے تھے۔ ان کی ناوقت موت نے مسلمانوں کو ایک عظیم قائد سے محروم کر دیا۔ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے ان کی موت کا غم منایا اور مسلمانانِ حیدرآباد تو ان کے بعد اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگے ان کی وفات کی خبر سن کر قائداعظم بے اختیار کہہ اٹھے کہ وہ "ایک سچا مسلمان تھا۔"

عبدالوحید خاں

حیدرآباد کا ٹیپو

"گلستان میں ہر صبح و شام نئے گل کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں روزانہ کلیاں چٹکتی ہیں اور چند دن بہار جاں فزا دکھلا کر خس و خاشاک بن جاتی ہیں نہ باغباں کو علم ہوتا ہے نہ گلچیں کو ان کی پرواہ لیکن اسی چمن کی کسی شاخ سے کبھی کبھی ایسے حیات افزا اور روح پرور پھول بھی پھوٹ نکلتے ہیں جن کی خوشبو سے باغ کا گوشہ گوشہ مہک اٹھتا ہے اور جس کی رعنائی دل سوزی کا سکہ ہر روش پر بیٹھ جاتا ہے۔

بہادر یار جنگ ہمارے چمنستان سیاست میں ایسے ہی "گل رنگین" بن کر نمودار ہوئے جن کی چمک دمک اور مہک نے چند ساعتوں میں نگاہوں کو خیرہ اور دلوں کو مسحور و مسخر کر لیا اور ان کی مختصر سی حیاتِ سیاسی کا ہر لمحہ جو گزرتا گیا بیش از بیش سرمستی و رعنائی سے ہمکنار ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے ہر گوشے اور ہر قریئے میں ان کا چرچا، ان کی آب و تاب کا شہرہ اور ان کے کمال و ہنر کا تذکرہ ہونے لگا۔ ۳۸-۱۹۳۷ء تک اک گل نو دمیدہ کی طرح ان کی مشک ریزیاں اور عطر بیزیاں حیدرآباد

کی سرزمین تک۔ محدود رہیں۔ بیرونی دنیا ان کے نام سے بھی زیادہ آشنا نہ تھی لیکن ۱۹۴۸ء میں جب کہ ابھی ان کی زندگی کی اکتالیس منزلیں بھی پوری نہ ہونے پائی تھیں جب ظالم کے دستِ جفا جو نے عین عالم شباب میں ان کو ختم کیا تو ہندوستان میں بسنے والا کون مسلمان ایسا تھا جس کی آنکھیں فرطِ الم سے اشکبار اور جس کا دل غم و اندوہ سے معمور و محزون نہ تھا۔ ہر مسلمان کا مکان ماتم کدہ اور ہر فرد آہ و بکا میں مبتلا تھا، قائدِ اعظم سے لے کر مسلم لیگ کے معمولی رضا کار تک اور ایک طالب علم سے لے کر بڑے سے بڑے عالم و ادیب تک ہر شخص ان کے غم میں چاک دامن نظر آتا تھا، اس عالمگیر محبت اور عام عقیدت کا سبب یہ تھا کہ ان کا وجود اس لالہ چمن کی طرح نہ تھا جس کا مقصد محض آرائش بزم اور دعوت نگاہ جو دلوں کو خوش اور دماغوں کو معطر کرتا ہے لیکن جس کا پہلو دل سے تہی اور دلِ سوز سے خالی ہو بلکہ وہ جس محفل کو زیبائش بخشتے اس کی شورشِ نہاں میں شریک اور اس کے سوزِ دروں سے وابستہ ہوتے، ان کے دل اور زبان میں کامل یگانگت اور نیت و عمل میں پوری رفاقت ہوتی تھی جس طرح ان کی زبان آتش فشانی اور گہر باری میں مصروف رہتی اسی طرح ان کا دل و دماغ قوم و ملت کے لیے ہر لمحہ سرگرم عمل تھا نہ صرف یہ کہ ان کا سخن دلنواز تھا بلکہ ان کو قدرت نے "نگہ بلند" اور "جاں پُرسوز" بھی عطا کی تھی، اور جس ایک فرد میں یہ صفات مجتمع ہوں اس کا وجود ہر قوم کے لیے نعمت ہے۔ "

پہلا تعارف

مجھے مرحوم سے پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے

سالانہ اجلاس کے موقع پر متعارف ہونے کا موقع ملا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کشیدگی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ کانگریس جماعتی مطلق العنانی (پارٹی ڈکٹیٹرشپ) کے نشے میں مخمور اور سات صوبوں میں اپنی وزارتوں کی طاقتوں سے مسحور و مغرور ہو کر مسلم سیاست کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی ایک طرف مسلم تمدن، زبان اور مذہب کو ہندوستانی قومیت میں ضم کرنے کی غرض سے واردھا اسکیم کا نفاذ ہو چکا تھا، یوپی، سی پی اور بہار میں مسلمانوں پر بے حد مظالم توڑے جا رہے تھے تاکہ وہ ہندو امپریلزم سے مرعوب و خوفزدہ ہو کر خود کو کانگریس کے حوالے کر دیں۔ سرکاری اسکولوں میں مہاتما گاندھی کی تصویر کی پوجا اور بندے ماترم کا گیت لازمی کر دیا گیا تھا۔ مہاتما جی نے اردو زبان ختم کرنے کے لیے ہندی ساہتیہ پریشد کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی زمانے میں مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کے مشوروں سے حیدرآباد میں ہندو مہاسبھا نے حکومت نظام کے خلاف عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی تھی جس میں دس ہزار سے زیادہ ہندو قید ہو چکے تھے۔

دوسری طرف حکومت برطانیہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی فیڈرل اسکیم کو نافذ کرنے پر مصر تھی اور مسلم لیگ کو کسی طرح منظور کرنے پر تیار نہ تھی یہی وہ زمانہ تھا جب کہ فلسطین میں امریکہ اور برطانیہ کی یہود نوازپالیسی کے خلاف مسلم لیگ اپنی صدائے احتجاج بلند کر رہی تھی اور اپنا ایک ڈیلی گیشن چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمٰن صدیقی پر مشتمل باہر بھیج چکی تھی۔

غرض کہ اس پس منظر میں پٹنہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں شرکت کی

غرض سے ہندوستان کے ہر حصّہ کے مسلمان آئے کسی طرح اجلاس میں شریک ہونے والے افراد کی تعداد دو لاکھ سے کم نہ تھی۔ تمام فضا جوش و خروش سے پُر نعرے اور ولولوں سے معمور تھی۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے اس اجتماع کو غنیمت سمجھتے ہوئے طے کیا کہ حیدر آباد میں جو سازشیں ہندو لیڈر کر رہے ہیں اور جس سے وہاں کی حکومت کے متزلزل ہونے کا کافی خطرہ ہے ان سے مسلم لیگ کے لیڈروں اور مسلم عوام کو باخبر کر دیں اور اس طرح مسلم ہندوستان کی ہمدردی حاصل کریں۔

پٹنہ میں بہادر یار جنگ کی موجودگی کا بہت کم لوگوں کو علم ہوا کیوں کہ اس وقت تک وہ کافی غیر معروف تھے ان کے متعلق صرف اتنا سنا تھا کہ اچھے مقرر ہیں۔ اتحاد المسلمین کے صدر اور خاکسار جماعت کے رکن ہیں، حیدر آباد کے جاگیر دار اور وہاں کے مقامی سیاسی کارکن ہیں، اسی لیے پٹنہ کے جلسہ عام میں جو مسلم لیگ کے پنڈال میں اس وقت منعقد ہوا جب مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس عبد العزیز صاحب بیرسٹر کی کوٹھی پر ہو رہا تھا شرکاء کی تعداد زیادہ نہ تھی۔

اجلاس ختم ہونے سے ایک روز قبل سر سلیمان مرحوم کے داماد چودھری اختر حسین صاحب (جو لکھنؤ میں ایک کامیاب وکیل اور لیجسلیٹو کونسل یوپی کے رکن تھے) کی طرف سے ارکان کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کو چائے کی دعوت کا پیام ملا جو بہادر یار جنگ مرحوم کے اعزاز میں تھی۔ مجھے جاگیر داری نظام، رؤسا اور نوابوں سے دلی نفرت تھی۔ اس زمانے میں عام طور پر جاگیر داروں اور نوابوں کو آزادیٔ ملک کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا تھا۔ غیر ملکی حکومت کے

خلاف بغاوت کے جذبات نے اپنے ملک کے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے خلاف بھی کافی نفرت پیدا کر دی تھی۔ عوام اس طبقے سے سب سے زیادہ بیزار اور نالاں تھے میں بھی فطری طور سے ان جذبات سے متاثر تھا اور حیدرآباد کے جاگیردار سے ملاقات کرنا تضیع اوقات اور ان سے تعارف وقرب کو فعلِ عبث سمجھتا تھا چنانچہ جب میں عمرانہ میں گیا تو نہایت بے اعتنائی اور لاپرواہی کے ساتھ مہمان خصوصی سے بہت دور جا کر بیٹھا اور میز کے ساتھیوں سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں موصوف کا تعارف کراتے ہوئے میزبان نے ان سے فرمائش کی کہ وہ حیدرآباد کے حالات سے ارکان کونسل کو آگاہ کریں، چشم زدن میں ایک دراز قامت شخص شکیل و وجیہہ حیدرآبادی خاص شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس نظروں کے سامنے آگیا، یہی بہادر یار جنگ تھے ان کے کھڑے ہونے کا انداز اور اپنے سامعین پر ایک مسکراہٹ آمیز نظر ڈالنے کا طریقہ عام انسانوں سے بالکل مختلف تھا ان کی شکل میں نہ لکھنوی نزاکت کی بو تھی نہ ان کے انداز میں حیدرآبادی سستیا کی خو، ان کی آنکھیں اندرونی بے پناہ قوت ارادی کا پتہ دیتی تھیں اور ان کے تیور ایک مومنانہ عزم اور فاتحانہ کردار کے آئینہ دار تھے، ابھی انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا کہ ان کے انداز نگاہ ہی نے میرے دل کے تمام وسوسے اور ذہن کے تمام تعصبات شیشے کی طرح چکنا چور کر دیئے، میں سنبھل کر بیٹھا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ شخص کوئی نواب نہیں بلکہ مجاہد معلوم ہوتا ہے، چند لمحات میں پھولوں کی بارش شروع ہو گئی ان کے بولنے کا طرز، دیکھنے کا انداز، الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ساخت مضامین کا

ترکیب و تنظیم فضا میں ان کی انگشت شہادت کی گردش، خیالات کی روانی افکار کا تسلسل یہ سب باتیں میرے لیے بالکل نئی اور اچھوتی تھیں ہر شخص ان کے خیالات کی زنجیروں میں بندھا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے مولانا آزاد کو بولتے سنا تھا ان کی چھپی ہوئی تقریروں کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا۔ مولانا احمد سعید اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی طویل دلچسپ اور دلآویز تقریریں متعدد مرتبہ سنی تھیں ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے رنگ میں عمدہ مقرر اور بلند پایہ خطیب ہے لیکن اس روز بات ہی کچھ اور تھی۔ اسمٰعیل شہید اور جمال الدین افغانی کی معجز نما تقریروں اور مجاہدانہ خطبات کے تذکرے کتابوں میں پڑھے تھے معلوم ہوتا تھا ان ہی تاریخی خطبات کو پڑھنے وہ خود زمین پر اتر آئے ہیں۔ آپ نے نہایت جامع اور تفصیلی طور سے حیدرآباد کا سیاسی پس منظر وہاں کی حکومت کی مفاد عامہ کے لیے کارگذاریاں اور ہندو لیڈروں کی ریشہ دوانیوں پر روشنی ڈالی اور نہایت غیر مبہم الفاظ میں یہ بھی بتا دیا کہ خود انھوں نے وہاں کے مسلمانوں کو اس طرح منظم کر دیا ہے کہ انگریز اور ہندو مل کر بھی ان کو شکست نہیں دے سکتے۔

تقریر ختم ہوئی تو میرا عجیب حال تھا، اب وہ بے اعتنائی باقی نہ تھی ان سے ملنے اور تعارف حاصل کرنے کی تمناؤں میں کروٹ لینے لگی، سب لوگ باری باری ان سے مصافحہ کرنے لگے۔ ایک مصنف کا سب سے بڑا ذریعہ تعارف اس کی کتاب ہوتی ہے۔ وہ بزعم خود اس کو ایک بڑا حربہ سمجھتا ہے کہ جس سے متعارف ہونا ہو اپنی تصنیف کا ایک نسخہ اس کو دے دے تاکہ اسے خود ہی معلوم ہو جائے کہ ملنے والا شخص ایک مولف ہے، یہ آسان نسخہ میرے ذہن

میں بھی آیا اور فوراً اپنی تازہ تصنیف "مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ" جس کا دوسرا ایڈیشن صرف دو تین ماہ قبل نکلا تھا ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا۔ آپ نے میرے ہاتھ سے کتاب لے کر سرورق پلٹ ڈالی اور پھر میری طرف مسکراہٹ آمیز لہجے میں دیکھ کر فرمایا۔

"یہ کتاب نہ صرف میرے پاس ہے بلکہ اتحاد المسلمین کی ہر شاخ میں لازمی طور سے ایک نسخہ رکھنے کا حکم دے چکا ہوں۔ لیکن مصنف کے ہاتھ سے کتاب حاصل کرنے کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ بہت شکریہ۔"

جب اجلاس سے فارغ ہو جائیں تو میری قیام گاہ پر تشریف لائیں۔ انشاء اللہ مفصل باتیں ہوں گی۔

اس مختصر تقریب کے بعد ہر جگہ ان کے دل نشیں انداز تقریر کا ذکر تھا ہر شخص جو ان سے ملتا اس نعمت کے ہاتھ آجانے پر خدا کا شکر ادا کرتا۔ رخصت سے قبل میں نے تقریباً نصف گھنٹے تک ان کی فرودگاہ پر گفتگو کی جس بے تکلفی، محبت اور خلوص سے آپ نے مجھ سے باتیں کیں میں سمجھا کہ شاید میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک تھا لیکن بعد میں ان سے بہت قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ فی الحقیقت ان کا طرز عمل ہر شخص سے ایسا ہی مربیانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا۔

حیدرآباد میں شاندار کامیابی

اس کے بعد سے میری خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا حیدرآباد کانفرنس کے موقع پر مجھے خاص طور سے شرکت کی دعوت دی اور بہت تاکید بھی کی لیکن بدقسمتی سے میں اس سعادت سے محروم رہا۔ دہلی میں مارچ ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کی ایک بڑی کانفرنس ہوئی۔ اس میں آپ کی کئی تقریریں عام جلسوں میں ہوئیں

جنھوں نے آپ کو مسلم عوام کے دلوں میں جاگزیں کر دیا۔
اسی دور میں آپ کو حیدر آباد میں بھی زبردست کامیابی ہوئی۔ قائد اعظم خود حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہاں اتحاد المسلمین کے رضا کاروں کی حیرت انگیز تنظیم کو بے حد پسند کیا۔ اس تنظیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان باوجود اقلیت ہونے کے نصف نمائندگی کے حقوق اسمبلی میں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی اور خود صدر منتخب ہوئے۔

دوسری ملاقات

۲۰ مارچ ۱۹۴۰ء کی صبح ۹ بجے دہلی میں مجھے دوسری مرتبہ ملنے کا شرف حاصل ہوا، اس کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۹ مارچ کی شام لاہور میں خاکساروں پر گولی چلی، دو دن بعد لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ اجلاس ہونے والا تھا جس میں تجویز پاکستان منظور ہوئی۔ خاکساروں اور پولیس کے تصادم نے بڑے تشویشناک حالات پیدا کر دیئے تھے، نواب صاحب بھی اس روز دہلی میں مقیم تھے۔ میں ۱۹ مارچ کی شام کو علامہ مشرقی اور قائد اعظم سے ملا تھا۔ علامہ مشرقی نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں مسٹر جناح تک ان کی یہ خواہش پہنچا دوں کہ وہ پنجاب گورنمنٹ اور خاکساروں میں سمجھوتہ کرا دیں میں نے جب مسٹر جناح کو ان کا پیغام پہنچایا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ ان سے جا کر کہہ دیں کہ مسلم لیگ کے اجلاس کے دوران میں وہ امن قائم رکھیں اور کوئی ایجی ٹیشن نہ کریں۔ ساتھ ہی چلتے وقت یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ صبح کو نواب بہادر یار جنگ دس بجے مجھ سے ملنے آ رہے ہیں۔ اس سے قبل ان کو ساتھ لے کر علامہ صاحب سے ملنا اور جو جواب وہ دیں مجھے صبح بتا دینا گویا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ صبح کو جب نواب صاحب

تشریف لائیں تو میں بھی ان کے ساتھ جاؤں۔ میں اسی وقت تقریباً ساڑھے دس بجے شب قرول باغ گیا تو علامہ صاحب کسی خفیہ جگہ روپوش ہو چکے تھے اور میرے آنے کے تھوڑی دیر بعد گرفتار ہو گئے۔ علی الصبح میں نواب صاحب کے پاس کورونیشن ہوٹل گیا اور رات کی دونوں ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ نواب صاحب پریشان تھے لیکن طبیعت کی شگفتگی اور ذہنی انشراح کی وہی کیفیت تھی۔ نجی گفتگو میں بھی بات بات پر پھلجھڑیاں کھلاتے تھے۔ ٹیکسی منگائی مجھے ساتھ لیا پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین کے پاس گئے پھر قرول باغ گئے اور خاکساروں کے سالار سے ملے جو اس وقت تک گرفتار نہ ہوئے تھے۔ ان کو ہدایت کی کہ "لاہور میں محاذ کا جو انچارج ہے اس کے پاس فوراً یہ پیغام بھیج دیں کہ جیسے ہی میں لاہور پہنچوں مجھ سے آکر مل دیگر اصحاب شوریٰ ملیں۔

وہاں سے سیدھے قائداعظم کے بنگلہ پر پہنچے۔ قائداعظم ایک منٹ کے بعد ہی خود باہر تشریف لائے اور نہایت بے تکلفی اور تپاک سے نواب صاحب سے ملے اور اپنے ساتھ ہم دونوں کو دارالمطالعہ میں لے گئے۔

خاکسار تحریک کو زندہ رکھنے کی کوشش

نواب صاحب خود کو مسٹر جناح کا سیاسی شاگرد سمجھتے تھے اور ہمیشہ ہی ادب کے ساتھ گفتگو کرتے تھے اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے کہ کوئی لفظ ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرے پھر بھی اپنی گفتگو کے انداز اور ظرافت آمیز جملوں سے خود بھی ہنستے اور قائداعظم کو بھی ہنساتے خود قائداعظم بھی ان سے جس طرح مکمل کر بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے مشابہ کسی اور سے نہ کرتے تھے۔ نواب صاحب کی گفتگو کا زیادہ زور خاکسار تحریک کی افادیت پر تھا۔ ان کو یہ فکر تھی کہ کہیں قائداعظم علامہ مشرقی کی غلطیوں

کی بناء پر تحریک کے مخالف نہ ہو جائیں۔ انھوں نے کافی دیر تک تبلیغی انداز میں اس تحریک کی موافقت میں لیکچر دیا لیکن ہر دفعہ قائداعظم نے محبت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کلام کو منقطع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ مجھے تحریک سے کوئی اختلاف نہیں لیکن جس طرح اس کو گزشتہ ایک سال سے چلایا جا رہا ہے اس کا شدید مخالف ہوں۔ نواب صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا :-

"مسٹر جناح میری کوشش اب تک یہ رہی ہے کہ مسلم لیگ کا دماغ اور خاکساروں کی قوت عمل آپس میں مربوط ہو کر ایک ناقابل شکست قوت بن جائیں اور میں اب تک مایوس نہیں ہوا ہوں میں خاکسار تحریک کو بچانا چاہتا ہوں اور مجھے آپ کی مدد کے بغیر اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔"

قائداعظم نے فوراً جواب دیا :-

"نواب صاحب مجھے آپ سے ہمدردی ہے، میں نے آپ کو ہمیشہ مسلم لیگ کا دوست اور مسلم سیاست کا مفید ستون سمجھا ہے لیکن یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ آپ نہیں جانتے مشرقی گمراہ قوت عمل کا پیکر ہیں۔ میں نے خود اس امر کی کوشش کی کہ خاکسار تحریک مسلم لیگ کا فوجی بازو بن جائے اور مشرقی بحیثیت سالار تحریک ہماری تنظیم کے ماتحت اس کو چلاتے رہیں۔ صلح و جنگ کرنے کا اختیار مسلم لیگ کو ہو پھر اگر کوئی طاقت اس جماعت پر حملہ کرنے کی نیت کرے تو ہم پوری طاقت سے اس کی مدافعت کریں۔ لیکن مشرقی نے اطاعت کورانہ اور تقلید محض کا جو جذبہ اپنے پیروؤں

میں پیدا کیا ہے وہ کسی دوسری جماعت کے ساتھ تحریک کو وابستہ نہ ہونے دے گی، مجھے خطرہ ہے یوپی میں شیعہ سنی تحریک میں الجھ کر اور پنجاب گورنمنٹ کے خلاف غیر آئینی اقدام کر کے مشرقی نے اپنے آپ کو اور اپنی تحریک کو ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ اب اس کے بقاء اور ارتقاء کی کوئی امید نہیں پھر بھی اگر یہ لوگ اپنا طرز عمل بدل لیں اور ہماری ہدایت کے مطابق کام کریں تو شاید کچھ دنوں میں حالات معمول پر آجائیں لیکن فوری طور سے ناممکن ہے۔ چلتے وقت قائد اعظم نے جب نواب صاحب سے معانقہ کیا تو فرمایا "اس مرتبہ اجلاس میں آپ کی تقریر کے لیے بہت دلچسپ موضوع تیار ہو رہا ہے۔"

اس سے مراد غالباً تجویز پاکستان تھی، نواب صاحب نے برجستہ یہ جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔

"میں امتحان سے پہلے پرچہ معلوم نہیں کرتا۔"

قائد اعظم کے ترجمان

اب نواب صاحب قائد اعظم کے باقاعدہ ترجمان بن چکے تھے۔ جہاں قائد اعظم تشریف لے جاتے نواب صاحب بھی بصد اصرار ضرور لے جائے جاتے اور قائد اعظم کی تقریروں کا ترجمہ جس خوبی اور کمال سے کیا جاتا اس سے لوگ بے حد متاثر ہوتے۔ دو تین سال میں ہندوستان کے ہر گوشے میں ان کا ڈنکا بج گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسوں کے وقت نواب صاحب تشریف لاتے اور باوجود رکن نہ ہونے کے ان میں شرکت فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ حیدر آباد کے ہندوؤں کی سازشوں اور مہاسبھا کے ایجی ٹیشن سے ارکان کونسل کو باخبر کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں

صاحب تشریف فرما تھے۔ مولانا نے تقریر کے دوران میں سوال کیا۔

"حضرت آپ نے مسلمانانِ ہند کو مدد کی دعوت ہی کب دی ... ؟"

اس سوال پر مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ان کی گردن تن گئی اور جواب دیا۔

"مولانا! میں کانٹا چبھتا ہے تو ہاتھ خود بخود نکالنے کو اٹھتا ہے آنکھوں سے آنسو خود بخود گرنے لگتے ہیں وہ دعوت کا انتظار نہیں کرتے اور میں تو کریلا ہوں نیم چڑھا یعنی مسلمان اور پھر پٹھان، آخر مجھ پر ہی بجلی گرے اور میں ہی آپ سے مدد کا طالب ہوں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

الہ آباد کا اجلاس لیگ

اپریل ۱۹۴۲ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ سر اسٹیفرڈ کرپس اپنی مشہور اسکیم لے کر ہندوستان آئے تھے اور اس پر غور کرنے اور پاکستان کے مطالبہ کا سرزور رد ادا کرنے کی غرض سے یہ اجلاس طلب کیا تھا۔ قائداعظم نے اس موقعہ پر بڑا پرجوش اور مدلل خطبۂ صدارت فی البدیہہ پڑھا اور حسب معمول اس کا ترجمہ بھی نواب صاحب نے کیا۔ آخری اجلاس میں چندے کی اپیل کی گئی۔ ایک شخص نے تلوار پیش کی۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں اس کا نیلام شروع کر دیا، پندرہ منٹ میں اکتالیس ہزار کا اعلان ہو گیا قائداعظم نے مداخلت کرتے ہوئے چندے کی اس بوچھاڑ کو روک دیا کہ بغیر رسید اس طرح روپے کی بارش میرے مسلک کے خلاف ہے۔ اس وقت ان کی تقریر کا اتنا اثر تھا کہ لوگ اس پر آمادہ تھے کہ جو بھی ان کے پاس ہے نچھاور کر جائیں الہ آباد کی تقریر کراچی کے اجلاس کے علاوہ سب سے بہتر خیال کی جاتی ہے۔

اقبال سے محبت

الہ آباد سے آپ میری دعوت پر لکھنؤ تشریف لے گئے جہاں تین دن قیام فرمایا اس کی صورت یہ ہوئی کہ میں نے لکھنؤ میں "ادارۂ اقبال" قائم کیا تھا جس کا مقصد علامہ اقبال کی تعلیمات کو مقبول بنانا اور ان کی شاعری کو عوام تک پہنچانا تھا جو ایک نئی اور غیر معمولی بات تھی۔ انیس اور دبیر کے شہر میں جس کا ہمیشہ نعرہ "اباد لاغیری" اقبال کو بہ حیثیت شاعر کے تسلیم کرنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کی اشاعت کے بعد کچھ عرصہ تک اودھ پنچ میں کارٹونوں کے ساتھ اقبال کے خلاف مضامین نکلتے رہے لکھنؤ کے ادیب، شعراء سوائے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے اقبال کو ایک مفکر اور بلند پایہ فلسفی تو مانتے تھے مگر زبان داں اور شاعر کی حیثیت سے ان کو کوئی درجہ نہیں دیتے تھے۔ میں نے ۱۹۲۱ء میں دہلی میں نواب صاحب سے ذکر کیا کہ آپ کو علامہ اقبال سے بے حد شغف ہے بلکہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے خیالات کی روانی اقبال کی مرہونِ منت ہے۔ آپ میری مدد فرمائیں۔ لکھنؤ میں "ادارہ اقبال" کا افتتاح آپ خود کریں ورنہ اس کی کوئی آواز نہ ہوگی۔

آنجہانی سر تیج بہادر سپرو کا یہی مشورہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ آئندہ سال میں ضرور لکھنؤ آجاؤں گا، اور اس کام کو انجام دوں گا۔ اتفاق سے اس سال الہ آباد میں اجلاس ہوگیا۔ جہاں آپ تشریف لائے۔ حیدر آباد سے روانہ ہونے سے قبل ہی لکھنؤ کا پروگرام مجھ سے طے ہوگیا۔ میں اسی سال اتفاق سے کچھ عرصہ کے لیے لکھنؤ کی شہری مسلم لیگ کا صدر بھی تھا اور میری خواہش تھی کہ مسلم لیگ کی طرف سے آپ کا استقبال ہو اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کی طرف سے ایڈریس پیش ہو۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ میں صرف "ادارہ اقبال" کی دعوت پر لکھنؤ جانا چاہتا ہوں اور اسی

ایک ادارے کے پلیٹ فارم پر تقریر کروں گا۔ اسی لیے اور کسی قسم کا کوئی اہتمام نہیں ہونا چاہیے آپ کی ادارہ اقبال کی تقریر کو نشر کرانے کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا لیکن عین وقت پر اوپر سے ہدایت آگئی اور یہ اہتمام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ جنگ کی پابندیوں کی وجہ سے کھلے میدان میں جلسہ نہ ہو سکتا تھا۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں جلسہ ہوا۔ علامہ سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا حسرت موہانی اور ساغر نظامی کے علاوہ یو۔پی کے تقریباً ہر جگہ کے ادیب اور علم دوست حضرات خاص طور سے شریک تھے۔ علامہ اقبال کی تعلیمات پر آپ نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ میں نے علامہ سلیمان ندوی اور مولانا دریابادی صاحبان کو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد واہ واہ کہتے دیکھا۔ عام حاضرین کی عجیب کیفیت تھی۔ مجھے یقین ہے کہ لکھنؤ میں نہ اس دن سے پیشتر کبھی ایسی تقریر ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد کبھی ہو سکی۔ کئی روز تک لکھنؤ میں آپ کے انداز تکلم اور طرز تقریر کا چرچا رہا۔

عبادت، سادگی اور بیباکی

اس شب سوا گیارہ بجے کے بعد کھانا کھایا گیا، کھانے کے بعد ایک بجے تک تمام مہمان آپ کی باتوں سے محظوظ اور علمی افکار سے مستفید ہوتے رہے۔ ایک بجے کے قریب آپ نے سونے کا ارادہ کیا چونکہ دیر زیادہ ہو چکی تھی۔ اس لیے آپ نے مجھ سے اپنی فرودگاہ (کوٹھی بیگم حبیب اللہ) پر اپنے کمرہ میں سونے کی فرمائش کی کیونکہ صبح کی گاڑی سے آپ کو واپس جانا تھا۔ اس لیے میں اس رات وہیں سو گیا۔ تقریباً چار بجے روشنی اور پیروں کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ چارپائی کے پاس جاء نماز بچھی ہے اور نواب صاحب نماز تہجد میں مصروف ہیں۔ نماز کے بعد دیر تک وظیفے میں مصروف رہے اور آخر میں دیر تک مسجود رہے اور گڑگڑا کر

دعا مانگتے رہے وظائف اور دعاؤں کے اوراد کا یہ عالم تھا کہ موٹر میں بیٹھتے تو زبان پر دعا جاری ہو جاتی اترتے تو دوسری دعا۔ غرض کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ عمل اور ذکر و فکر میں مصروف رہتا تھا۔

آپ اکثر فرماتے تھے کہ جب تک سرزمین حیدرآباد سے وہ دھبہ نہیں دھولیتا جو ٹیپو کے خلاف سازش کر کے لگ چکا ہے اس وقت تک میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ باوجود ریاستی شان و شوکت اور نوابی ساز و سامان کے گھریلو زندگی میں سادگی کا یہ عالم تھا کہ جب سفر میں ملازم کپڑے تیار کرتا اور پہناتا تو آپ کو تکلیف ہوتی۔ آپ فرماتے کہ گھر پر یہ کام اپنے ملازمین سے کبھی نہیں لیتا کرتا تو خود چاہتا ہوں لیکن نیک بخت بیوی باوجود منع کرنے کے خود اپنے ہاتھوں سے جوتوں پر پالش کرتی ہے اور کپڑے پہناتی ہے۔

ریاست و ملوکیت کے ماحول میں حق گوئی و بے باکی کا گذر کم ہوتا ہے لیکن آپ نے نظام سے دوستی اور وفا کے پیمان کے باوجود کبھی حق بات کہنے سے گریز نہیں کیا۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں ولی عہد حکومت کو سرکار برطانیہ سے خطاب ملا آپ نے اس پر نہایت واضح الفاظ میں اپنے اختلافات کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ حیدرآباد کی داخلی آزادی پر ایک ضرب کاری ہے۔ کاش حکومت حیدرآباد بھی وائسرائے ہند کو خطاب دینے کی طاقت اپنے اندر رکھتی۔

اسی زمانے میں سکندرآباد میں حکومت نظام کے جھنڈے کو سلامی دیتے وقت آپ نے فرمایا۔

"اگر یہ جھنڈا خاندان آصف جاہی کی سطوت کا نشان ہے تو میرے دل میں اس کی کوئی عزت نہیں لیکن اگر یہ علم دکن میں مسلمانوں کی

عظمت کا نشان ہے اور اسلام کی عزت و شوکت کا مظہر ہے تو میرا
سر اس کے آگے سرنگوں ہے۔"

حکومت برطانیہ اور حکومت حیدرآباد اس قسم کے مجاہدانہ اور حق پرستانہ اعلانات کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ نظام نے پہلے تو ایک سال کے لیے زبان بندی کا حکم صادر کیا پھر حیدرآباد کے کسی اخبار میں اپنی عطا کردہ جاگیر کا طعنہ دیا۔ آپ نے فوراً ہی تمام خطابات سے استعفا دے دیا اور جاگیر معہ اسناد کے نظام کو واپس کر دیں۔ آپ کے اس اقدام نے تمام ہندوستان میں ایک شورِ تحسین بلند کر دیا۔ مجھ سے دہلی کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ ۱۹۴۳ء کے موقعہ پر فرمایا کہ خدا کی قسم اقبال کے ایک شعر نے مجھے اس اقدام پر مجبور کر دیا جب میری خودداری اور رزق کے درمیان کش مکش جاری تھی تو میرے لبوں پر اکثر یہ شعر خود بخود جاری ہو جاتا اور جب تک میں نے خود کو پنجہ ہوس سے آزاد نہیں کر لیا اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ شعر یہ تھا:۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی

نظام ملوکیت و شہنشاہی میں اس قسم کی صاف گوئی اور حق پرستی کی گنجائش کہاں ہے۔ اعلاء کلمۃ الحق کا جو خمیازہ علامہ جمال الدین افغانی کو ترکی میں بھگتنا پڑا۔ وہی بہادر یار جنگ کے لیے حیدرآباد میں مقدر تھا۔ جمال الدین کو زہر آلود حلال کے ذریعہ ختم کیا گیا اور بہادر یار جنگ کو حقے میں زہر دے کر جس روز ان کی جاگیر اور خطابات کی واگزاری و بازیابی کے احکام صادر ہوئے لیکن ان کی موت کے بعد اس لیے خدا کا شکر ہے کہ جب اس مرد مجاہد کو شہید کیا گیا تو وہ حکومت حیدرآباد

کا باج گزار بہادر یار جنگ نہیں بلکہ حیدرآباد کا ٹیپو بہادر سفال تھا۔ سرزمین دکن میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

عبدالہادی صدیقی

دیوانۂ کوئے محبت

برعظیم پاک و ہند کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں بیسویں صدی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسی صدی میں سیاسی انقلاب آئے معاشرتی تبدیلیاں ہوئیں، پرانی تحریکوں کی جگہ نئی تحریکوں نے لے لی۔ سماجی اور تہذیبی اقدار بدلے۔ ان تبدیلیوں اور تغیرات نے مسلمانوں کی ملی اور سیاسی زندگی میں ہلچل پیدا کردی مسلمانوں کی جامد اور ساکت زندگی میں حرکت پیدا کرنے میں ان دیوانوں کا بڑا ہاتھ ہے جن کی فغانِ صبحگاہی نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا۔ ان کے متجدد ذہنوں کو فکر کی حرارت بخشی۔ ان ہی سرپھرے دیوانوں نے ایک لٹے ہوئے اور گم کردہ راہ قافلے کو منزل کی راہ سجھائی۔ انھیں راستے کے پیچ و خم سے آگاہ کیا، اپنے لہو سے چراغ روشن کیے جن کی روشنی میں ایک بھٹکا ہوا قافلہ منزل کی طرف بڑھتا گیا پھر وہ دن بھی آیا جب کہ اس نے اپنی منزل کو پالیا

یہ فغاں صبحگاہی کبھی پنجاب کی مردم خیز سرزمین سے بلند ہوئی تو کبھی سندھ کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے کبھی گنگ و جمن کے مرغزاروں میں تو کبھی بنگال کے میدانوں میں گونجی۔ کبھی علی گڑھ کی فضاؤں سے تو کبھی دکن کی سرزمین سے بلند ہوئی یہ دیوانے لیلائے امت کی زلفوں کے اسیر تھے لیکن ان کی دیوانگی میں بھی عجیب شان تھی کہ باوجود ایک ہی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہونے کے وہ ایک دوسرے کے رقیب نہ تھے۔ ان دیوانوں کا عشق ایک تھا اس لیے ان کا دین ایک تھا، خدا ایک تھا وہ سب کے سب شمعِ محمدیؐ کے پروانے تھے اور اس پر متفق کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

ان دیوانوں میں ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کے نزدیک فرقہ، صوبہ، قومیت، رنگ اور نسل کا امتیاز اور تعصب کفر کے مماثل تھا۔ ان کا جذبۂ اخوت عالمگیر تھا اور وہ سارے ابنائے وطن کو اسی جذبہ سے سرشار دیکھنا چاہتے تھے۔

ان معمارانِ قوم میں بہادر یار جنگ بھی تھے جن کی زندگی ملت کے لیے وقف تھی۔ ان کا پیغام بھی وہی تھا جو محمدؐ عربی کا تھا۔ خلفائے راشدین کا پیغام تھا، داتا گنج بخش شاہ عبداللطیف بھٹائی، معین الدین اجمیری، سرسید، اقبال علی برادران، حضرت موہانی، قائداعظم اور لیاقت علی خاں کا پیغام تھا۔

بہادر یار جنگ کی شخصیت میں غضب کی گہرائی اور گیرائی تھی۔ وہ ایسی صفات سے مزین تھے جو شاذ و نادر ہی کسی کے حصے میں آتی ہیں۔ ان کی شخصیت ہر پہلو اور ہر زاویئے سے مکمل اور ہمہ گیر نظر آتی ہے۔ وجاہت اور دلآویزی رنگ

روپ، سرخی اور سپیدی کا ایسا حسین امتزاج کہ یوسفِ ثانی کہیں تو بجا ہے کردار ایسا بے داغ کہ فرشتوں کا گمان گزرے۔ شجاعت اور دلیری ایسی کہ بدر اور احد کے دلیروں کی یاد تازہ ہو جائے۔ صبر و استقامت اور توکل و قناعت ایسے کہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوں۔ خودداری کا یہ عالم کہ ایسی سرداری کو ٹھوکر ماردی جس سے خودی کی موت کا اندیشہ ہوا۔

فنِ خطابت کو ان پر ناز تھا۔ یہ صلاحیت اکتسابی نہیں بلکہ خداداد تھی ان کے ہر فقرے میں گہری معنویت ہوتی تھی۔ وسیع علمی پس منظر، زبان کی چاشنی برمحل اشعار، آواز میں گھن گرج، لب و لہجے کا اتار چڑھاؤ ایک اعجاز تھا ایک سحر تھا، ایک مسیحائی تھی۔ ان کی تقریر خواہ کسی موضوع پر ہو اُس کا محور و مرکز مذہب ہوتا۔ سیاست ہو یا تمدن، ثقافت ہو یا تاریخ ان سب کا مرکز اتصال وہ دین ہی کو سمجھتے تھے۔

نواب صاحب مرحوم کو قرآن حکیم سے عشق تھا تفسیر کے دوران اُن کی آواز گلوگیر ہو جاتی اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ دعائے ماثورہ پر گریہ طاری ہو گیا اور سامعین کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"خانۂ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لیے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں، جلسہ آرائیوں اور ہماہمی کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے یہی ان کی پناہ گاہ ہے۔"

جن لوگوں نے نواب صاحب مرحوم کو خلوت و جلوت میں دیکھا ہے ان کا کہنا

ہے کہ نواب صاحب سنتِ نبویؐ کے والہ و شیدا تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے انھیں بے پناہ عشق تھا۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ تھا ان کا کردار ہمیشہ بے داغ رہا۔ وہ نہ صرف گفتار کے بلکہ کردار کے بھی غازی تھے۔ وہ ان قائدین میں نہیں تھے جو پلیٹ فارم سے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں، پند و نصائح کے موتی برساتے ہیں مگر "چوں بخلوت می روند آں کار دیگری کنند"۔

نواب صاحب خاندانی نواب اور رہا گیر دار تھے۔ نوابیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ رقص و سرود، چنگ و رباب، مطرب و مغنی کی سرپرستی کرتے مگر وہ بھی عجیب نواب تھے کہ چنگ و رباب کی بجائے شمشیر و سناں اٹھالی۔ دولت لٹائی بھی تو بیواؤں، یتیموں میں، حاجت مندوں میں بے کسوں اور نادار وں میں اور پھر اتنی داد و دہش کے بعد بھی اللہ کے حضور گڑگڑا کر کہتے کہ:

"بارالہا! تیرے اس گنہگار اور عاجز بندے سے تیری خلق کی کیا خدمت ہو سکتی ہے اس میں طاقت ہی کہاں ہے"۔

عشقِ محمدیؐ کا یہ عالم تھا کہ برسوں کی پریشانیوں کے بعد خوشحالی کے دن آئے اور لوگوں نے کہا کہ اب چند سال چین اور سکون سے گزارئیے۔ لیکن یہ مردِ مومن جس کی نظر سوئے افلاک تھی وہ عقاب جس کو اپنی منزل بے کراں آسمانوں میں نظر آتی تھی، کارِ آشیاں بندی میں کہاں گرفتار ہوتا، اس کے سر میں تو کیفی اور سودا سمایا ہوا تھا وہ دیوانہ وار سوئے بطحا روانہ ہوئے۔

درویشی اور قلندری کا یہ عالم تھا کہ خطاب اور جاگیر سے دستبردار ہو کر مسرور ہو گئے اور لوگوں سے کہا کہ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اب دیوانۂ محبت جیب و دامن کو فکر سے آزاد ہو رہا ہے"۔

نواب صاحب کی ڈیوڑھی "بیت الامت" مرکز رشد و ہدایت تھی جہاں سے علم و عرفان کی کرنیں نکلتی تھیں۔ فلسفہ، سیاست، علم و ادب، حدیث و فقہ اور قرآن غرض کہ ہر مسئلے پر سیر حاصل مباحثے ہوتے اور عقدہ کشائیاں ہوتیں۔

صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کا طوطی بول رہا تھا اور خان برادران نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی قبر بنائی جائے گی۔ سامری کو توڑنے کے لیے قائداعظم کی نظر انتخاب بہادر یار جنگ پر پڑی۔ بہادر یار جنگ دیوانہ وار صوبہ سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دنوں صوبہ سرحد کے سرکردہ پر سفر کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ فقیر ایپی کی خطرناک سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ سردار اورنگ زیب خاں، قاضی محمد عیسیٰ اور بہادر یار جنگ دورے پر روانہ ہوتے ہیں۔ قاضی محمد عیسیٰ کار چلا رہے ہیں۔ فقیر ایپی کے حلقے کے اصول کے مطابق موٹر ڈرائیور پہلا شکار ہوتا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ کو قاضی عیسیٰ کی زندگی بہت عزیز ہے وہ انھیں خود ہٹا کر اسٹیرنگ سنبھال لیتے ہیں۔ سفر جاری تھا کہ چٹانوں کے پیچھے سے ایک رائفل بردار قبائلی نمودار ہوتا ہے۔ موٹر روک کر پوچھتا ہے کہ آپ میں بہادر یار جنگ کون ہے؟ نواب صاحب اپنی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ ان تنہائی میں گفتگو کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ سردار اورنگ زیب خاں اور قاضی محمد عیسیٰ بہادر یار جنگ کو کار سے اترنے سے منع کرتے ہیں مگر شیر دل مجاہد کار سے اتر کر قبائلی کے ساتھ چلا پڑتا ہے۔ تنہائی میں لے جا کر قبائلی انھیں فقیر ایپی کا پیغام سناتا ہے کہ "فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے کہ ہمیں آپ کی آمد کی اطلاع تھی اس لیے آپ کے بحفاظت سفر کے انتظامات کر دیے گئے ہیں۔ آپ جہاں جہاں جانا چاہیں ہمیں بتا دیجیے کہ ہم وہاں بھی حفاظتی انتظامات کر دیں۔"

کیا سحر تھا اور کیا اعجاز تھا کہ جان کے دشمن بھی جان نثاری پر آمادہ ہو گئے نواب صاحب نے اپنی شعلہ آشام تقریروں سے صوبہ سرحد کے غیور پٹھانوں کی غیرت کو جگایا اور ان کی کوششوں کی بدولت صوبہ سرحد کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

غرض کہ کہاں تک اس داستان کو سمیٹا جائے۔ اس کو جتنا سمیٹئے اتنی پھیلتی جائے گی۔ شعلہ آشام

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم میں سے وہ آدم گر اٹھ گیا جس کی دنیا جہانِ مرغ و ماہی نہیں بلکہ فغانِ صبحگاہی تھی۔ وہ پھول چھن گیا جو نازشِ بہار تھا۔ وہ فقیر اٹھ گیا جو واقفِ اسرارِ سلطانی تھا اور جس کی فطرت میں جہاں بینی تھی۔ وہ گدائے میکدہ جاتا رہا جس نے مے توحید پلا کر عالم میں وتو کو مٹا دیا تھا جو سرمایۂ محراب و منبر تھا جس کی نوا نوائے عاشقانہ اور جس کی دعا دعائے نیم شبی تھی۔ وہ ایسا شاہین تھا جس نے زاغ و زغن میں بلند پروازی پیدا کی۔ وہ میر کارواں کہ مہر و ماہ و مشتری جس کے ہم عنان تھے۔ وہ مجاہد جس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں عشقِ محمدی کی تیغ جگر دار تھی۔ وہ بندۂ حق بیں و حق اندیش جو زہرِ ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکا۔ اس طرح شیریں مقال کے نغمے اس وقت تک فردوس گوش رہیں گے جب تک کہ کوہ ہمالیہ قائم ہے، جب تک کہ گنگ و جمن کے مرغزاروں میں بہار آتی رہے گی اور جب تک کہ راوی کی لہروں میں پیچ و خم باقی ہیں۔

پیر علی محمد راشدی

چمن کی کہانی صبا کی زبانی

لب پر ہی کبھی آ نہ سکا نام تمہارا
دل نے تو کئی بار، کئی بار پکارا
اک بار جو مل جائیں وہ بچھڑے ہوئے لمحے
سو بار مجھے تلخیٔ ایام گوارا

وہ پھول جن کی مہک مردوں کو زندہ کر دے در و دیوار پر نہیں اُگتے۔ وہ صدیوں میں ایک بار، فطرت کے کسی ٹیڑھے موڈ کی بدولت کسی مناسب زمین پر کسی خاص موسم میں گھڑی بھر کے لیے کھلتے ہیں، ساعت بھری عطر بیزی کرتے ہیں۔ لمحہ دو لمحہ چمن کی کہانی صبا کی زبانی سنتے ہیں لمحہ دو لمحہ ماحول کا جائزہ لیتے ہیں پھر رنگ گلستاں دیکھ کر تنگ آ جاتے ہیں، تنہائی محسوس کرتے ہیں، مایوس ہو جاتے ہیں، مرجھانے لگتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

اندھی دنیا کو وقت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کہیں جنت کا پھول بھی کھلا تھا۔ وہ اب موقعہ پر آتی بھی ہے تو کیا دیکھتی ہے؟

[illegible] پژمردہ، پتے پریشان، ٹہنی سوگوار۔ ڈنڈیاں سر بریدہ، [illegible] پنکھڑیاں [illegible] پر بکھری پڑی ہیں۔ بادِ مخالف کے جھونکے آ رہے ہیں

..... ان سنگھڑیوں کو بھی اڑا کر لے جانے والے ہیں پھر

مٹی نا پھر دل جو گیا　　مٹی نا پھر دل جو گیا
نہیں ہن لبھنے لعل گواچے　　مٹی نا پھر دل جو گیا

جس دنیا نے زمین سے ہمیشہ ڈنڈے اُگتے دیکھے ہوں اور کبھی دستورے تک کا پھول ملاحظہ نہ فرمایا ہو، اس کو کہاں محسوس ہوتا ہے کہ کس قسم کا پھول کھلا تھا؟ کیوں کھلا تھا؟ کیوں مرجھا گیا؟ کیا کہہ گیا، فضا سے۔ صبا سے۔ گلشن سے۔ گلچیں سے۔ گل فروش سے۔ صیاد سے؟ آخر کچھ تو کہا ہوگا۔

مگر ان باتوں کا کس کو خیال رہتا؟ ان باتوں میں کون پڑتا۔ یہ باتیں کس کو یاد رہتیں من و سلویٰ جس کسی کی دعاؤں کے طفیل اُترتا تھا اُتر آیا اور قبضہ میں کر لیا گیا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء اب کھاؤ پیو۔ گانے گاؤ اساطیر الاولین میں پڑنے کی کیا ضرورت رہی؟ آں دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب برد، و قصاب ہم مرد، نہ کسی کا لینا رہا نہ کسی کا دینا!

سچ تو یہ ہے کہ ایک لحاظ سے اچھا ہوا کہ اچھے وقت پر کل رخصت ہو گیا۔ بعد کے ہزار داستانوں کی ہزار داستانیاں نہ سننا پڑیں۔

(۲)

اس ضعیف نے نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی بہار تھوڑا ہی عرصہ دیکھی ۱۹۳۸ء سے شروع ۱۹۴۴ء تک ــــ اس وقت وہ نوابی کی منزل سے آگے نکل چکے تھے۔ ملت مصطفویہ کے سپاہی بن چکے تھے۔ ان کی نوابی آن بان جس نے دیکھی ہو دیکھی ہو۔ خاکسار نے تو ان کے تیر و کمان کی شان دیکھی۔

بہادر یار جنگ کے کام اور مقام کا اندازہ اس وقت ہونا مشکل ہے

جب تک ہم پچیس سال پیچھے ہٹ کر دوبارہ اسی دور میں نہیں پہنچ جاتے ہیں جس دور میں بہادر یار جنگ پہلی بار ہمارے سامنے میدان جنگ میں جلوہ گر ہوئے تھے۔

زمانہ بدل رہا تھا، انگریز بوڑھا ہو چلا تھا مگر مانتا نہیں تھا۔ ہندو نے یہ حقیقت بھانپ لی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ عنقریب ورثے کا سوال اٹھنے والا ہے۔ اس کا فیصلہ تھا کہ اس کی ساری میراث پر وہ خود قبضہ کر لے گا۔ اس کے پاس ضروری ساز و سامان موجود تھے لیڈر، تحریک، تنظیم، نصب العین، پریس، پیسہ اور لڑنے کی صلاحیت۔!

ہندوؤں کا شور و غوغا سن کر مسلمان قوم کی آنکھ کھلنے لگی تھی۔ مگر جیسے ہمیشہ ہوتا رہا ہے مسلم قیادت تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔

- انگریز کے وفادار
- کانگریس کے ہوا خواہ ــــ اور
- مسلم لیگی

نعرۂ توحید تینوں اطراف سے بلند ہو رہا تھا تینوں جماعتیں پروگراموں سے آراستہ، انعامات کے وعدے وعید پھیلاتی پھر رہی تھیں۔

(۳)

آیئے ذرا ان کا جائزہ لیں۔

انگریزی پارٹی میں ملک کے تقریباً سارے خان بہادران، سر صاحبان، نواب صاحبان، کارخانہ دار صاحبان، ٹھیکہ دار صاحبان اور مسلم افسر صاحبان (لاٹھیاں چلوانے والے، جعلی مقدمہ تیار کرنے والے، بغل میں بال جبریل لے کر چلنے والے اور آنکھوں میں سولا کر لا تفسدوا فی الارض کو ٹھکرانے والے) شامل تھے۔ نشانہ ثانیہ

اسلامیہ کے بارے میں ان کا پیش کردہ پروگرام اس طرح تھا۔

- اولوالامر کی اطاعت، یعنی تاج برطانیہ سے وفاداری
- حاکم ضلع کی غلامی
- حاکم علاقہ کی فرماں برداری
- ہر درجے کے سرکاری اہلکار کی چاپلوسی
- عوام کے دماغوں پر تالے، ان کی زبانوں پر زنجیر، سیاسی فکر سے پرہیز، سیاسی عمل سے گریز، مجموعی طور پر زندگی مرغی خانہ کی زندگی ہو یعنی پنجرے کے اندر بند رہو، آب و دانہ چگتی رہو۔ کثرت سے انڈے دیئے جاؤ۔ اور بانگ و انگ کی پرانی عادتیں چھوڑ دو۔"

اس تنظیم اور حقیقت پرستی سے کئی فوائد اور دور رس اچھے نتائج پھوٹ نکلے تھے مثلاً امن۔ انتظامی استحکام۔ ملکی تعمیر۔ اقتصادی ترقی۔ ریل گاڑیاں۔ پکے راستے۔ پل، عمارتیں۔ اسکول، کالج۔ اسکالرشپ۔ سرکاری ملازمتیں، آنریری مجسٹریٹیاں، پنچایتیں، چنگیاں، لوکل بورڈ، رورل اپلفٹ، جداانتخاب آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں، کونسل کی ممبریاں، خطاب، تمغے، غرض انگریز اولوالامر کے زیر سایہ ترقی اس قدر بے پناہ ہوئی تھی کہ حاکم بدمن، رازق حقیقی سے رجوع کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں رہتی۔

(۴)

دوسری طرف کانگریسی شوالے کے مسلمان پجاری تھے۔ ان کے پروگرام کی اساس بھی "نان اور امان" تھی یعنی۔

ان داتا بدلاؤ۔ انگریز کی جگہ ہندو بٹھاؤ۔ اپنی کوئی ہوس

مت رکھو۔ ایاز قدر خود بشناس۔ تم اقلیت ہو، ان پڑھ ہو، کسی کام کے نہیں ہو، خموشی سے وطن کی پوجا کرتے رہو، امن چاہو، امن مانگو، مذہبی اور روحانی اقدار کو بنیاد سیاست نہ بناؤ، سیاسیات کی بنیاد شکمیات پر رکھو، ملک کی تعمیر میں حصہ لو کانگریسی صوبوں میں وزیر بنو۔ مسلمانوں کو سرکاری نوکریاں لے کر دو۔ برلا کے کارخانوں میں قوم کو آسامیاں دلواؤ، اپنے سر جاجی فدوی سر جاجی لکھو موم بتی والا کو، کانگریسی وزارتوں کی مہربانی سے زیادہ سرمایہ دار اور زیادہ فربہ بننے کے مواقع میسر کر دو۔ سر فدوی سے تحریک کے لیے چندہ لو۔ اس سے خیرات لے کر قوم کے بچوں میں انعام تقسیم تاکہ ابتداء سے ہی برخوردار وں میں خیرات لینے کی صلاحیت پیدا ہو، سیٹھ جی کی نانی فوت ہو جائے تو اس مرحومہ کے نام سے دارالعلوم بناؤ، ہر لیول پر مال و دولت جمع کرو، خوشحال بنو، چین و عرب کو بھول جاؤ، بھارت کی باتیں کرو، جانو، گانو، مانو گاؤ کعبہ کی یاد ستائے تو کاشی سے دل بہلاؤ۔ احکامات الٰہی یاد رکھو۔

- "لا تلقوا الی التھلکۃ"
- "لکم دینکم ولی دین"
- "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ"
- "واللہ مع الصابرین" وغیرہ وغیرہ۔

(۵)

تیسری پارٹی مسلم لیگ تھی۔ اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہو رہا تھا۔ وہ سال

ذرائع میں دوسری دونوں پارٹیوں سے بدرجہا کم تھی پاس پیسہ تھا نہ پرچہ۔ چند مایوس بوڑھے سید شمس الحسن کے کاندھے پر لدی رہتی تھیں اور ان کو لیگ کا مرکزی دفتر کہا جاتا تھا۔ ممبری دو آنے میں بھی مہنگی سمجھی جاتی تھی شمس الحسن دو آنی مانگتے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی شخص ان کو جھڑک نہ دے مسلم صوبوں کے کسی اسمبلی میں لیگ پارٹی کا قائم ہونا بعید از قیاس تھا۔ مسلم ریاستوں کے والی اس کو ایک مذاق سمجھتے تھے۔ انگریز کو بعض مسلم سر صاحبان نے اطمینان دلا دیا تھا کہ ہندوستان کی سیاست میں لیگ کو کوئی مقام حاصل نہیں کانگریس کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان کے اندر محض دو طاقتیں تھیں۔ انگریز اور خود کانگریس لیگ کوئی چیز نہیں۔ غرض ہر لحاظ سے مسلم لیگ ہندوستان کی لاغر ترین اور غریب ترین جماعت تھی۔ اس کا سارا سرمایہ حضرت قائد اعظم علیہ الرحمۃ کا ذاتی عزم تھا یا ان کے ساتھ شہید ملت علیہ الرحمۃ کی وابستگی ان دنوں ۳۵ء والا فیڈرل آئین آچکا تھا۔ لیگ کے پاس جو کچھ تھا وہ اس آئین کی مخالفت پر صرف ہو رہا تھا۔ مگر فیڈرل اسکیم نہ ہو تو کیا ہو؟ اس سوال کا جواب ہنوز مرتب ہو رہا تھا۔ پاکستان بعد کی بات تھی۔ اس کے متعلق لاہور قرارداد چند سال بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں منظور ہونے والی تھی۔ اغراض و مقاصد میں اس کا اندراج اور ایک سال بعد (۱۹۴۱ء) میں ہونا تھا۔

(۶)

اس وقت کے سیاسی حلقوں میں مسلم لیگ کس حد تک فضول اور بیکار چیز سمجھی جاتی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ (پہلے کے دستور کے مطابق) اس موقعہ پر مسلم سر صاحبان یا وزیر صاحبان میں سے کسی نے "مسلم لیگ" نام پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیگ کے سلسلہ میں یہ نسخہ ہر شخص کو معلوم تھا۔ ۱۹۲۰ء

اور ۱۹۳۰ء کے ماہین دو مرتبہ استعمال ہو چکا تھا۔ پہلی بار اللہ جانے کس طرح مگر بہ یک وقت دو مسلم لیگیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک لیگ کی صدارت کامل اتفاق رائے سے مرحوم سر محمد شفیع کے سپرد کی گئی تھی۔ دوسری بار "مسلم کانفرنس" کے نام سے وہی کام ہوا۔ سوائے حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ باقی سب حضرات اس "مسلم کانفرنس" میں پہنچ گئے تھے اور کچھ عرصہ تک مسلم لیگ کو ریٹائر کرا دیا تھا۔ اب اگر ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء کے بیچ والے عرصہ میں بھی مسلم لیگ نام کی کوئی قیمت ہوتی تو یار لوگ یقیناً پہلے والے نسخہ سے دوبارہ مستفید ہونے کی کوشش کرتے اور اس نام پر قبضہ کر لیتے۔ کم از کم لیگ کو کمزور کرنے کی نیت سے اس کو دو حصوں میں کاٹ کر رکھ دیتے۔ وقت کے مقتدر حضرات کے سامنے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ تھوڑی سی توجہ کی ضرورت تھی تھوڑی سی رقم لگانی پڑتی مناسب سیاسی اور سماجی کارکنوں کی خدمات حاصل کرنے کا سوال ہوتا۔ مگر کسی شخص کا خیال اس طرف نہیں گیا۔ سبب یہ تھا اس موقعہ پر لیگ کی وقعت اتنی رہی ہی نہیں تھی کہ کوئی ذات شریف اس نام پر دھاوا بول دینے کی زحمت گوارا فرماتے۔

(۷)

جس موقعہ کا ذکر ہو رہا ہے اس موقعہ پر یہ تین پارٹیاں سرکاری، کانگریسی اور مسلم لیگی میدان میں آ چکی تھیں تینوں مسلم عوام کو اپنی اپنی طرف بلا رہی تھیں مگر مسلم عوام کہیں جا نہیں رہے تھے وہ جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہتے تھے ان کی اکثریت ان پڑھ تھی، مگر عقل اور خداداد شعور کی نعمتوں سے مالا مال تھی۔ ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ بہت ہی نازک مقام سامنے آ رہا ہے۔ اگر کوئی غلط قدم

اٹھایا گیا تو نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوگی فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا، حالات کے مطالعہ گہری سوچ اور تحمل کی ضرورت تھی قوم اس سوچ میں سر راہ کھڑی ہر طرف دیکھ رہی تھی ابھی کوئی راہ بر اس سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔

(۸)

مسلم عوام کی بے علمی کی بات آگئی ہے تو بعض چیزوں کی وضاحت کرنی ضروری نظر آرہی ہے۔ اس قوم کی ہمیشہ سے ایک عجیب سی کیفیت رہی ہے اس کی تاریخ پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے یہ کوئی خاص قسم کی مخلوق ہے۔ سو فی صدی پڑھی لکھی یہ قوم کبھی نہیں تھی! کوئی ایسا دور نہیں آیا جب اس قوم نے کسی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے اسکولوں اور مدرسوں میں داخل ہو کر خود کو سو فی صدی "تعلیم یافتہ" بنالیا ہو۔ مگر باوجود اس کے یہ "ان پڑھ" قوم ہمیشہ معرکے کے کام سرانجام دیتی رہی۔ درسی تعلیم کی کمی کبھی اس کے کسی بڑے کام میں حارج نہیں ہوئی جب کبھی لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کی کمی محسوس ہوئی عقل خداداد کی فراوانی نے اس کمی کو بدرجہ احسن پورا کر دیا۔

یہ بات اس قدر پیچیدہ نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کو کچھ نہ کچھ خاص چیزیں عطا فرمائیں۔ رنگ کا فرق ہو، کھوپڑی کے شیپ کا فرق ہو بھیجے کے وزن کا فرق ہو، جسم کی ساخت کا فرق ہو، جسمانی قوت کا فرق ہو دماغی صلاحیتوں کا فرق ہو، طبیعتوں کا فرق ہو، مگر کچھ نہ کچھ فرق ضرور رکھا۔

اب اس قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مسلمان قوم اور باقی اقوام کے مابین کونسا فرق کونسی امتیازی چیز رکھی؟ خصوصاً اس حالت میں جب کہ اس قوم سے امۃ اخرجت للناس تکونوا شہداء علی الناس کا کام لینا منظور ہوا؟

ظاہر ہے کہ باری تعالیٰ نے قوم کو عقل سلیم اور روشنی طبع کی نعمتیں عطا فرمائیں اور اس فراوانی سے کہ عام تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہ قوم کسی بڑے امتحان میں کسی اہم میدان میں کسی اور قوم کے مقابلہ میں کبھی پیچھے نہیں رہی۔ اس قوم کے ان پڑھوں نے مہذب اور متمدن دنیا کو اکبر اعظم جیسا بادشاہ فراہم کر دیا۔ اس قوم کے امیوں میں سب سے بڑا اور آخری پیغمبر خدا (فداہ ابی و امی) پیدا ہوا ؎

نگارس کہ بمکتب نرفت خط نہ نوشت

بہ غمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

(اس نکتہ کو اور واضح کرنے کے لیے ضمناً ایک مثال عرض کر دینی ضروری ہے۔ ہندوستانی سیاسیات کے سلسلہ میں اپنے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کی طرح سکھوں کی قوم کو بھی فیصلہ کرنا تھا مسلمانوں کے مقابلہ میں سکھ زیادہ پڑھے لکھے تھے مگر آپ نے دیکھ لیا کہ سکھ صاحبان نے کیا فیصلہ کیا؟ سیاسی شعور کا مدار اگر تنہا لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پر ہوتا تو ہندوستان کے نقشہ پر آج سکھستان بھی نظر آتا۔ مگر جو کچھ ہو گذرا دنیا کے سامنے ہے! تعلیم یافتہ سکھ صاحبان کی نسبت اپنے ان پڑھ مسلمانوں کا ہی فیصلہ صحیح رہا۔)

(۹)

ابھی عرض کر چکا ہوں کہ مسلم عوام کو تین پارٹیوں کی طرف سے دعوت شمولیت مل رہی تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ کس طرف جائیں۔

یہی موقعہ تھا جب ایک سپاہی سرزمین صادق سے روانہ ہوا۔ غالباً یہ تہیہ کیے ہوئے کہ وہ اپنے ایک ہی عمل سے نہ فقط تاریخ کے سارے نئے پرانے قرضے ادا کر دے گا مگر مستقبل کی تاریخ کو بھی ہمیشہ کے لیے

اپنا مقروض بنا لے گا۔

یہ شخص بمبئی پہنچا۔ قائداعظم سے سیاسی بیعت کی، ان کے علم کے نیچے کھڑے ہو کر ملّت اسلامیہ کے اس بلال ثانی نے مسلم عوام کو صدا دی۔

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!

اب یہ "مسلم ہے تو۔۔۔" کی شرط بڑی اہم چیز تھی۔ یہی روح تھی اس تحریک کی جو شروع ہو رہی تھی یہی ابتدائی نکتہ تھا بننے والی تاریخ کا۔ یہی نچوڑ تھا اسی جذبہ کا جو ہماری ساری ظاہری بے سروسامانیوں اور "جہالتوں" کے باوجود ہم کو آگے لے جانے والا تھا۔ یہی خشت اولین تھی اس بنیاد کی جس بنیاد پر بعد میں پاکستان کی عمارت کھینچنے والی تھی۔ یہی رنگ جاں بنی تھی جسد پاکستان تھی۔ یہی کلید تھی اس جنّت کی جس جنّت کے عشق میں کروڑہا مسلمانوں نے اپنے لیے دنیا کا دارالحزن بن جانا یا دارالحزن ہو کر رہ جانا قبول کیا۔

مصیبت یہ ہے کہ بڑے عرصہ تک ہمارے اکابرین ملّت کی تعمیری معروضیت اس قدر سخت اور اس قدر گوناگوں رہیں کہ اس عظیم تاریخی سفر کی ابتدائی منزل یاد کرنے کی نہ انھیں خود کبھی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ اوروں کو یاد کرنے کی مہلت دی۔ آخر یہ تو دیکھنا چاہیے تھا کہ کہاں سے چلے تھے؟ کس طرف چلے تھے؟ ابھی تک اسی راہ پر چل رہے ہیں یا کہیں بھٹک گئے ہیں تو اب کہاں کا رخ ہے اور کہاں جا کر انتہا ہو گی؟

بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا اصل بات یہ تھی کہ جیسے بہادر یار جنگ کی صدا:۔

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔

فضا میں گونجی مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا فیصلہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کا راستہ اختیار کیا جائے۔

(۱۰)

صحیح یا غلط اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے لیکن جہاں تک میری بصارت یا معلومات کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس راستے کو بنانے والے اور اس راستے پر مسلم عوام کو لے کر چلنے والے تو یقیناً قائد اعظم علیہ الرحمۃ تھے مگر جب مسلمانوں کا قافلہ اس راستہ پر چل رہا تھا تو کسی مسافر نے مشعل راہ ضرور بہادر یار جنگ کے ہاتھ میں دیکھی تھی ہر بڑے قافلہ کے سلسلہ میں مختلف لوگوں کو مختلف فرائض بجالانے پڑتے ہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا لالٹین دکھانے کا فرض بہادر یار جنگ مرحوم کے سپرد تھا۔ یہ وہی تھے جو راستے کے زیر و بم پر روشنی ڈالتے چل رہے تھے یہ وہی تھے جو راستے کے ہر موڑ کی حقیقت اور اہمیت سمجھاتے جاتے تھے۔ وہی تھے جو تھکے ماندے اور متذبذب مسافروں کو اطمینان دلاتے چلتے تھے کہ یہ راستہ دیار حبیب کا ہے ترکستان کا نہیں:

- مسلم لیگ کی مسلمیت، ثابت کرنے والے۔
- "مسلمیت" کی "وطنیت" پر افضلیت ظاہر کرنے والے۔
- اور اس "افضلیت" کو چمکا کر لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلانے والے

یہ شخص تھے جب کبھی یہ سوال پیدا ہوئے (اور یہ اس وقت کے بہت ہی اہم سوال تھے۔ جو دشمن خواہ دوستوں کی طرف سے قدم قدم پر اٹھائے جا رہے تھے) کہ:۔

۱۔ مسلمانوں کی سیاست پر مذہب کو کیوں حاوی ہونے دیا جائے۔

۲۔ اتفاقاً اگر مذہب ہی سیاست کا محور بن جائے تو اس حالت میں بھی قیادت مسلم لیگ کو کیوں سونپی جائے جب کہ جمعیۃ العلماء موجود ہو، اور

۴۔ اگر اسلام کو ہی کلید زندگی بنا دیا جائے تو وہ اسلام پرانا چودہ سو سال پہلے والا کیوں ہو اور کیوں نہ بالامتزاج اجتہاد و استبداد اس اسلام کو موڈرن بنا دیا جائے تاکہ ع

شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو؟

ان سوالات کے جوابات، قرآن اور حدیث کی روشنی میں دینے والا، اور اس سلسلہ میں ہر شخص کو مطمئن کر کے مسلم لیگ کے راستے پر ڈال دینے والا بہادر یار جنگ تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب کبھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر کانگریسی (خواہ بعض لیگی) مولوی صاحبان کی یورش ہوئی یا انگریزی خواں طبقہ کی طرف سے "نئے وقت کی نئی ضروریات" کے بہانہ پر اعتراضات ہوئے تو اکثر بہادر یار جنگ بلائے جاتے تھے اور ان کی تصریحات سن کر لوگوں کی آنکھیں کھل جاتی تھیں، ان کے دلوں سے وسوسہ اور شبہات ختم ہو جاتے تھے اور نئی ہمت کے ساتھ وہ اس قافلہ میں شامل ہو کر آگے چل پڑتے تھے۔

خبر نہیں اس تحریک کی تاریخ کون لکھے گا؟ کب لکھے گا؟ مورخ لکھے گا؟ یا یہ کام بھی تمغا بیدار سے لیا جائے گا؟ اور تمغا بیدار خدا سے ڈر کر سچ لکھے گا یا اس پرانے کام کی کریڈٹ کا مستحق بھی اپنے تمغا نے یا اپنے حضور ضلع کو گردانے گا؟ بہرحال جو کچھ تقدیر میں ہوگا ہو کر رہے گا مگر ایک حقیقت بڑے سے بڑے موڈرن مسیلمہ کذاب سے بھی غالباً چھپائے نہیں چھپے گی۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ تحریک کے دوران بہادر یار جنگ مرحوم نے بیک وقت بلال اور غزالی کے فرائض سرانجام دیئے اور وہ قطعاً فیصلہ کن ثابت ہوئے۔

ویسے تو مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کے سلسلہ میں سوائے چند مغضوب علیہم اور ضالین کے باقی ہر مسلمان نے کسی نہ کسی اسٹیج پر، کسی نہ کسی طریقہ سے براہ راست نہیں تو بالواسطہ، ابتدا میں نہیں تو کچھ نہ کچھ کام کیا۔ قائد اعظمؒ اور قائد ملتؒ کی بات اور تھی پاکستان کے سلسلہ میں ان کا مقام اس قدر بلند رہا کہ ان کی گرد پا تک کوئی اور شخص نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مگر ان کو چھوڑ کر جب باقیوں کی خدمات کا حساب کتاب ہو رہا ہو تو خواہ مخواہ کی تنگ دلی برتنی اپنی پست فطرتی اور خساست دکھانی ہوگی۔ آخر واقعات اور تاریخی حقائق کو کہاں تک کوئی شخص جھٹلا سکتا ہے؟ کسی نہ کسی منزل پر سچ اور حق، کذب اور باطل کے پردے چیر کر باہر نکل ہی آئے گا۔ یہ قانون قدرت ہے اس سے مفر نہیں رات کے بعد دن ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ ہر چیز کے سلسلہ میں فوری طور پر قبضہ اور اختیار کی بات بڑی بات ہوتی ہے جس کی لاٹھی اور اس کی بھینس، جو چیز جس شخص کے قبضہ میں آجائے وہ اس کے متعلق جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ سندھ کے کسی پولیس سپاہی نے ایک اشتہاری ڈاکو کو پکڑ لیا۔ ڈاکو کی گرفتاری پر انعام مقرر تھا۔ تھانیدار صاحب ضلع کو اطلاع دیتے وقت کہہ دیا کہ ڈاکو "فدوی" کے ہاتھ گرفتار ہوا (یعنی تھانیدار نے خود پکڑا) سپاہی غریب کا نام کہیں آنے نہیں دیا۔ انعام کی رقم تھانیدار کے اپنے نام منظور ہو گئی اور وہ لے کر کھا گیا۔ عرصہ کے بعد تھانے کی انسپکشن (INSPECTION) ہوئی اس موقعہ پر ہر سپاہی کو اجازت تھی کہ صاحب ضلع کی خدمت میں براہ راست اپنے ذاتی معروضات پیش کرے۔ اس سپاہی نے عرض کی کہ "بندہ نے فلاں ڈاکو پکڑا تھا مگر انعام سے محروم رہا۔" صاحب ضلع نے کاغذات منگا کر دیکھے۔ تھانیدار کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اس میں کہیں سپاہی کا نام نہیں تھا۔ ہر جگہ فدوی یعنی تھانیدار

کی اپنی خدمات جلیلہ کا ذکر تھا۔ رپورٹ سننے کے بعد سپاہی بولا۔
"بندہ پرور، بیڈا کو تو اس بندہ نے پکڑا تھا۔ یہ فدوی۔۔۔۔ کون ہوتے ہیں جو اس قصّہ کے بیچ میں آ گھسے ہیں؟"

اس عجیب و غریب دنیا میں نہ سپاہیوں کی کمی رہی ہے نہ "فدویوں" کی دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ کس موقعہ پر سپاہی کون تھا اور تھانیدار کون اور انسپکشن کیسا ہو رہی ہے؟

اگر کوئی شخص آج بہادر یار جنگ مرحوم کی خدمات کا ذکر کر رہا ہے یا تاریخ پاکستان کی تشکیل میں ان کے حصّہ کا اندازہ لگا رہا ہے تو اس سے اس کی مُراد یہ نہیں سمجھنی چاہیئے کہ وہ "کسی فدوی" کے ہاتھوں سے پہلے سے وصول شدہ انعام کی رقم چھین کر بہادر یار جنگ یا اس کو یاد کرنے والوں کی طرف ٹرانسفر کرنا چاہتا ہے۔ بہادر یار جنگ زندگی میں بھی ان چیزوں سے بالا رہے اور موت کے بعد تو ان کے مقام کا کہنا ہی کیا؟ جو لوگ خوشنودیٔ خدا کے لیے خدمتِ خلق کرتے ہیں وہ مخلوق سے مزدوری نہیں مانگتے۔ جو لوگ عشق رسولؐ میں امت رسول کی چاکری کرتے ہیں وہ امتِ رسولؐ سے تنخواہ وصول نہیں کرتے۔ جن کے نام لوحِ محفوظ پر لکھے جانے والے ہوتے ہیں وہ اپنے نام پتھر کے ٹکڑوں پر کندہ کرواتے یا طلائی تختیاں لے کر فیتے کاٹتے نہیں پھرتے۔ ان کی اقدار اور ہوتی ہیں، اُن کے مقام اور ہوتے ہیں، ان کے انعام اور ہوتے ہیں۔ لہٰذا ذکر بہادر کے بارے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے ع

تو در طرب او و قامت یار

ممکن ہے بعض ناواقف یا فرومایہ لوگ یہ کہہ دیں کہ بہادر یار جنگ اچھے مقرر یا خطیب تھے اور بس۔

مگر یہ کب ہوا کہ محض تقاریر یا خطابت سے قوموں کی قسمتیں بدلیں؟ زبان سے جب تک دل کا اشتراک نہ ہو الفاظ بے اثر رہتے ہیں آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ اور دل اس وقت تک کہاں بیدار اور متحرک ہوتا ہے جب تک اس میں ایمان، سچائی اور جذبہ صحیح کی برقی رو نہ پہنچ گئی ہو؟

بہادر یار جنگ مرحوم کی عظمت کا حقیقی چشمہ ان کی زبان نہیں بلکہ ان کا دل درد آشنا تھا اور کسی انسان کے حصہ میں اگر دلِ درد آشنا آجائے تو اس سے زیادہ خوش نصیب اس سے زیادہ غنی، اس سے زیادہ قوی، اس سے زیادہ مقبولِ خالق و مخلوق اور اس سے زیادہ کامیاب کون ہے؟ یہی دل تو ہے جو انسان کو دنیائے آب و گل سے اٹھا کر اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں ملائک کا گذر بھی مشکل ہے جو خالق اور مخلوق میں حائل حجاب کے سارے پردے اٹھا دیتا ہے جو چشم زدن میں آسمان و زمین کے فاصلے ختم کرا دیتا ہے۔؟

(۱۳)

کئی اور صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک ہونے کے سوا بہادر یار جنگ مرحوم اپنے وقت کے بہت بڑے مدبر اور ڈپلومیٹ بھی تھے۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک لیگ کی سیاسیات میں کئی بحرانی حالات پیدا ہوئے اور تقریباً ہر موقعہ پر بہادر یار جنگ کی معاملہ فہمی، ان کا سیاسی تدبر، ان کا تحمل اور بردباری قوم کے کام آئے۔ کبھی ظاہر اور کبھی پس پردہ۔

یہ موقعہ نہیں کہ ان کے سارے واقعات کی تفصیل دی جائے۔ یہ کام مستقل

کے مورخوں اور محققوں کا ہے۔ صرف اشارتاً اسی دور کے بعض معاملات اور واقعات کا حوالہ دے رہا ہوں جس کے سلسلہ میں اسی خاکسار نے بہادر یار جنگ مرحوم کو بڑی مستعدی سے بڑا ہی اہم پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ مثلاً

- پنجاب کے حکمران یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے معاملات
- جناح سکندر پیکٹ
- قرارداد پاکستان کے حق میں مسلم اکثریت والے صوبوں کے برسر اقتدار پارٹیوں کی رائے ہموار کرنا۔
- مسلم اقلیت والے صوبوں کے دو چار مسلم لیگی حضرات نے پس پردہ یہ بات چلا رکھی تھی کہ ہندوؤں کو پاکستان کے نام سے ڈرا دھمکا کر اُن سے اس بات پر سمجھوتہ کر لیا جائے کہ بھارت کے ہر صوبے میں ہندوؤں کو مساوی نمائندگی ہو یعنی مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کو ۵ فیصدی نمائندگی ہو اور اس کے عوض مسلم اکثریت والے صوبوں میں ہندوؤں کو ۵ فی صدی نمائندگی دی جائے اور جب یہ اصول قبول ہو جائے تو پاکستان کا مطالبہ چھوڑ دیا جائے۔
- خاکسار اور مسلم لیگ
- برطانیہ کی قائم کردہ قومی دفاعی کونسل کے سلسلہ میں بحران اور مسلم وزراء اعلیٰ مسلم لیگ سے سرکشی کا امکان۔
- مدراس مسلم لیگ اجلاس کے موقعہ پر قرارداد پاکستان کو لیگ کے اغراض و مقاصد میں داخل کرتے وقت جو اندرونی اختلافات پیدا ہو رہے تھے ان کو روکنے کا بندوبست

- ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں کو اسٹیٹس کانگریس کے اثر سے نکال کر اس طرح مسلم لیگ کے قریب لے آنا کہ والیانِ ریاست بھی حد سے زیادہ برہم ہو کر مسلم لیگ کے خلاف ہندوؤں کا ساتھ نہ دیں۔
- جمعیتہ العلماء کے پیدا کردہ مسائل۔
- بعض مسلم لیگی علماء کے اعتراضات۔
- حیدر آباد کا مسئلہ۔
- صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم۔
- ہندوستان بھر میں انتخابات۔

یہ اور اسی قسم کے کچھ اور معاملات تھے جن کے سلسلہ میں محض تقریروں اور حسنِ خطابت سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ معاملہ فہمی، تدبّر، تحمل، سنجیدگی اور اعلیٰ قسم کی ڈپلومیسی کی ضرورت تھی بہادر یار جنگ مرحوم نے حضرت قائدِ اعظم کی قیادت اور رہنمائی میں ان مسائل کے بارے میں اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے ان ساری خوبیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ مظاہرے کیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو ان خوبیوں سے آراستہ کیا تھا اور وقت آنے پر انھوں نے اپنی قوم کو اپنی ان خوبیوں سے خوب خوب مستفید ہونے کا موقعہ دیا۔

بہادر یار جنگ مرحوم کے کمالات کے متعلق اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر سوداگر بازار میں وہی چیز لاتے ہیں جس کی مانگ ہو۔ اب نہ وہ خریدار رہے اور نہ اس چیز کی مانگ، نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ لوگ۔

پنجابی کے شاعر ہدایت اللہ مرحوم نے کیا خوب کہا تھا ؎

ساڈے نال دے رہنے ناں رکھ (درخت) لوکو
جھڑے پھل پتر، شاخاں سک گیاں
بھلی چال شطرنج ہدایت اللہ
بازی ہر دہوئی، گوٹا تک گیاں

چودھری غلام عباس

پیکرِ خلق و انکسار

اس سال (۱۹۴۳ء) مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس میری صدارت سری نگر میں منعقد ہوا جس میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔ جلسہ سے دو چار روز قبل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کشمیر نے ہمارے اجلاس پر بے دلیل اور ناقابلِ برداشت پابندیاں عائد کر دیں جس کے ماتحت اجلاس کا انعقاد ہی خارج از بحث تھا۔ صدارتی خطبہ [illegible] کر دی گئی تھی۔ جلسہ رات کو شروع ہونے والا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم قریب دن کے ۱۲ بجے سری نگر پہنچے۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ اس وقت میرواعظ منزل میں جلسہ کے متعلق حکومت کی جانب سے عائد کردہ شرائط پر غور کر رہی تھی کہ نواب صاحب بھی وہاں تشریف لے آئے۔ میری ان کے ساتھ

یہ پہلی ملاقات تھی اس سے قبل محترمی میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر "ہمایوں" کے توسل سے نواب صاحب سے صرف غائبانہ تعارف تھا۔ میاں صاحب مسلم کانفرنس کی نشاۃ ثانیہ کے بعد دو سال متواتر گرمیوں میں سری نگر آتے رہے، اور اپنے قیام کے دوران انھوں نے مسلم کانفرنس کی تنظیم اور استحکام کے سلسلہ میں بے حد دلچسپی لی اور دوڑ دھوپ کی۔ جماعتی مذاکرات کے سلسلہ میں ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ان ملاقاتوں میں میاں صاحب اکثر نواب صاحب مرحوم کی تعریفیں کیا کرتے تھے اس وجہ سے نواب کے ساتھ میرا اشتیاق ملاقات بہت بڑھ چکا تھا میر واعظ منزل میں پہنچ کر نواب صاحب نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا اور صرف چند باتیں قائداعظم کی مدائح میں بیان فرما رہے تھے کہ حکومت کی جانب سے سری نگر سے ان کے اخراج کا حکم پہنچ گیا۔ اس خبر سے ہم سب گم سم ہو گئے۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے کہ نواب صاحب خلاف ورزی احکام کریں یا بامجبوری کشمیر سے واپس تشریف لے جائیں۔ مجلس عاملہ کے اکثر ممبروں کی خواہش تھی کہ نواب صاحب اس حکم کی خلاف ورزی کر کے قید ہو جائیں۔ لیکن نواب صاحب کو یہ پوزیشن معقول وجوہ کی بنا پر منظور نہ تھی مجھے بھی ان سے اتفاق تھا کیونکہ نواب صاحب کی گرفتاری سے مسلم لیگ کی پوزیشن مخدوش ہونے کا احتمال تھا اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ حضرت قائداعظم ہمارے اس فیصلہ پر کبھی صاد نہ کریں گے۔ بلکہ ناراض ہو جائیں گے۔ اندریں حالات ہم نے بمصداق "یار زندہ صحبت باقی" نواب صاحب کو رخصت کیا میر واعظ منزل سے باہر جامع مسجد تک زائرین کا بے پناہ ہجوم تھا جس نے نواب بہادر یار جنگ

زندہ باد کے نعروں سے فضائے آسمانی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ بھی ان کے ہمراہ تشریف لائی تھیں ان کے قیام کا انتظام ہم نے ہاؤس بوٹ میں بمقام ڈل گیٹ کر رکھا تھا۔ نواب صاحب سیدھے اپنی قیامگاہ پر تشریف لے گئے تاکہ وہاں سے بیگم صاحبہ کو ساتھ لے کر عازم راولپنڈی ہو جائیں۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ نواب صاحب کو پولیس افسروں نے نہایت توہین آمیز اور تحکمانہ انداز سے ہاؤس بوٹ سے نکالا اور سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں پہنچایا۔ ایس ایس پی کا سلوک اور زیادہ ذلیل اور افسوسناک تھا۔ باوجودیکہ بارش کی وجہ سے موسم کافی خنک تھا لیکن حکومت کشمیر نے اپنی روایتی ذلت اور تعصب کا اس طرح ثبوت دیا کہ نواب صاحب اور ان کی بیگم کو جن کی سرینگر میں کوئی جان پہچان نہ تھی بستر تک ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی اور رات کی تاریکی اور خنکی اور موسلا دھار بارش میں ان کو ہارلپگل کے پار چھوڑ دیا گیا۔ اسی رات میں نے بحیثیت صدر کھلے اجلاس نواب صاحب کے ساتھ حکومت کے ناروا سلوک اور جلسے پر شدید پابندیوں کے خلاف بطور احتجاج سالانہ اجلاس کو بند کر دیا۔ عوام کے جذبات چونکہ نواب صاحب کے بارے میں بہت مشتعل تھے اور لوگ بے قابو ہو رہے تھے اس لیے میں نے مختصر سی تقریر میں ان کو صبر کی تلقین کی اور حکومت کشمیر کے متعصبانہ اور کمینہ سلوک کے خلاف شدید نکتہ چینی کی۔

نواب صاحب سے میں نے دوسرے روز راولپنڈی میں جا کر ملاقات کی ان کے ساتھ ناروا سلوک اور ذہنی اور جسمانی تکلیف اور پریشانی کے

متعلق اظہار افسوس کیا لیکن وہ پیکرِ خلق وانکسار اور مجسمہ انسانیت وبردباری تھے۔ میرا تمام جسم ندامت کے باعث عرق عرق ہو رہا تھا لیکن انھوں نے فدوی پیشانی اور مالی حوصلگی سے میرے جذبات واحساسات کو نوازتے ہوئے معاملہ کو ختم کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے اور ان کے مراسم بہت بڑھ گئے۔ خدا ترسی یا خدا پرستی دین داری پرہیزگاری اور بے باکی متانت و سنجیدگی اور دل نوازی و بندہ پروری کے اعتبار سے دنیا میں ان کے مرتبے کے چند نفوس ہی مل سکیں گے۔ میرے نزدیک اس چودھویں صدی میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی صفات کا صحیح نمونہ نواب مرحوم تھے۔ ان کے پائے کا مقرر اردو میں آج تک غالباً پیدا نہیں ہوا۔

کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر نہایت ہی موثر اور رلا دینے والی تقریر کے بعد وہ جب بیٹھے تو میں ان کے ساتھ کی کرسی پر تھا۔ میں ان کی تقریر سے بے حد متاثر اور وارفتہ ہو گیا میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا لیکن سادہ مزاجی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود اسے چوما اور بعد میں میری پیشانی پر بوسہ دیا اتنی عظیم المرتبت شخصیت اور لوگوں کے ساتھ یہ برتاؤ اور یہ اخلاق خدا کی دین ہے۔ وہ جسے چاہے سرفراز کرے۔

۱۹۴۴ء میں حضرت قائداعظم سری نگر میں تھے نواب صاحب کی وفات ان ہی ایام میں ہوئی۔ ان دنوں قائداعظم ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے میں اس روز ان کی خدمت میں جا رہا تھا کہ حضرت قائداعظم اور مس فاطمہ جناح نے بند پر دریا کے اس طرف ملے میں نے عرض کی آپ کی طرف جا رہا تھا

فرمایا میں اس وقت شاپنگ کے لیے گھر سے نکلا ہوں میرے اصرار پر کہ کام بہت ضروری ہے۔ انھوں نے مراجعت فرمائی اور ہم شکارے میں بیٹھ کر دریا کے پار ہاؤس بوٹ میں داخل ہوئے۔ جب حضرت قائداعظم آرام سے بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگایا تو میں نے نواب صاحب کی وفات کی خبر ان کو سنائی۔ اس کے بعد کمرے میں سکوت طاری ہو گیا مجھے خود انتہائی صدمہ تھا لیکن فرطِ غم کے باوجود اس اثنا میں حضرت قائداعظم کے چہرے پر نظر ڈال لیتا تھا رنج و غم آپ کے چہرے سے عیاں تھے پانچ منٹ کے بعد قائداعظم نے فرمایا کہ غالباً پہلی دفعہ مجھے کسی کی موت سے اتنا شدید صدمہ ہوا ہے پھر نواب صاحب کی خوبیاں بیان کیں اس کے بعد مرحوم کی بیگم کو بذریعہ تار پیغام تعزیت بھجوایا۔

مولانا غلام محمد

بہادر یار جنگ یا تشکّل فکرِ اقبال

فکر پاکیزہ ہو یا منفعت آلودہ، پیام دینی ہو یا لادینی، اپنے عملی اظہار اور غلبہ کے لیے وہ ہمیشہ شخصی تشکل کا محتاج رہا ہے۔ مارکسیت روسیوں میں اس وقت تک نفوذ نہ کر سکی جب تک کہ اس کو لینن کا شخصی تشکل حاصل نہ ہوا۔ البتہ ناتسیت فوراً انقلاب انگیز اس لیے ہو گئی کہ ہٹلر خود ہی ناتسی فکر کا عملی پیکر بھی تھا۔ خود ہدایتِ ربّانی اور فکرِ ایمانی بھی اسی لیے نہایت سریع

النفوذ اور انقلاب آفرین رہی ہے کہ جس لمحہ وہ انسانی ہاتھوں میں مکتوب ہو کر پہنچی ہے ٹھیک اسی لمحہ دیکھنے والے کی نگاہ کے سامنے نبی اور رسول کا شخصی تشکل ایک پیکر نور بن کر موجود رہا نبی کا وجود فکر ایمانی کا وہ اثر انگیز اور جاذب قلب و نظر شخص ہوتا ہے جس کے ہوتے اہل امت کی عقل تعبیر فکر کی پراگندگی سے محفوظ رہتی ہے اور یقین واثق کے ساتھ عملی اقدام پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں ہمارے دور غلامی کا خاتمہ بھی ایک صحیح اسلامی فکر کا رہین منت ہے اور ہندی مسلمان کو یہ فکر حکیم مشرق علامہ شیخ محمد اقبال نے دی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ خود اپنے فکر کے عملی ترجمان نہ تھے جس کا کھلے بندوں اعتراف انھوں نے کیا ہے ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اقبال کے شاگرد خاص ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم نے اپنے مضمون "اقبال کی زندگی" میں اس سلسلہ کا ایک واضح لطیفہ لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا (تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر ہی رہے)۔ اقبال نے جواب دیا، سنو بھائی، تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے مؤدب کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں، بیہوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے میں تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمھارے ساتھ ناچنے لگ جاؤں؟" آگے خلیفہ صاحب لکھتے ہیں۔" اس بیان میں اقبال نے بڑے ظریفانہ انداز میں

ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے جس طرح فطرت میں تقسیم عمل ہے، اسی طرح افراد میں بھی ہونی چاہیئے۔" یہ "ہونی چاہیئے" والا خیال قابل تسلیم ہویا نہ ہو مگر اقبال کے بارے میں یہ بات ماننی پڑتی ہے وہ جس فکر کو پیش کر رہے تھے اس کا شخص ان کی ذات میں موجود نہ تھا اور جیسے کہ تمہید میں بتایا جا چکا، فکر اس وقت تک بے اثر رہتی ہے جب تک کہ اس کا عملی پیکر انسانی نگاہ کے سامنے آ نہ جائے، چنانچہ فکر اقبال بھی ابتداً انقلاب انگیز نہ ہو سکی مگر چونکہ حکیم مشرق میں اخلاص تھا، ملت کا سوز و درد ان کو بے قرار کیے ہوئے تھا، اہل اسلام کی سربلندی کے وہ دل و جان سے خواہاں تھے اس لیے ان کی فکر بارگاہ ربوبیت میں مقبول ہوئی اور قدرت نے اس کے تشکل کا سامان کر دیا اور جس طرح مطلع مشرق سے سے ابھرنے والے آفتاب کی روشنی اپنا اولین تعین بہت دور مغربی افق پر کرتی ہے، اسی طرح شمال مغربی ہند سے ابھرنے والی فکر نے اپنا پہلا تعین کافی دور قطب دکن کے ارتفاع پر کیا جو مسلم عہد مغلیہ کی حریت کا آخری مرکز تھا، یہاں فکر اقبال کو ایک قالب موزوں مل گیا جس کو ہم "بہادر یار جنگ" کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس شخص کو پا کر فکر اقبال ہندی مسلمانوں کے سامنے متشکل ہو کر آ گئی اور "شنیدہ" کو "دیدہ" پا کر یکایک مسلمانان ہند میں ذوق انقلاب پیدا ہو گیا۔ یہ کوئی شاعرانہ تعبیر نہیں بلکہ ایک ٹھوس تاریخی حقیقت ہے۔

دیکھئے علامہ اقبال کی اصل شاعری کا آغاز ۱۹۰۸ء کے بعد سے ہوتا ہے جب وہ دیار غرب کا مشاہدہ اور معائنہ کر کے ہندوستان واپس آئے تھے۔

اس سفر سے واپسی کے بعد اقبال نے کچھ عرصہ پروفیسری کی۔ پھر بیرسٹری کا پیشہ اختیار کیا اور اسی دوران اپنی فکر کو وہ شاعرانہ پیرایہ میں جستہ جستہ پیش کرنے لگے، مگر مرتب صورت میں ان کی فکر پہلی بار ۱۹۱۰ء میں پیش ہو سکی جو "اسرارِ خودی" کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ اب قدرت کی کرشمہ سامانی دیکھئے کہ ادھر شمال مغربی ہند سے یہ فکر ابھری، اُدھر ناف جنوب کے شہر حیدرآباد میں اس کے تشکل کا سامان ہو رہا تھا۔ بلدہ حیدرآباد کے ایک سیر چشم، غیور اور مجاہد خانوادہ میں ۱۹۰۵ء میں محمد بہادر خاں پیدا ہوئے ہیں۔ ذہانت و فطانت، فکر و نظر، صداقت و امانت، جرأت و ہمت اور للّٰہیت و ایثارِ نفس کی بے پناہ صلاحیتیں لیے ہوئے سراپا محبوبیت اور ذاتی و اکتسابی نفوذ کی اپنی آپ مثال! بہادر یار جنگ کا نمو جسمانی بھی اور دماغی بھی، عام بچوں سے تیز تر رہا، نوجوانی میں باپ کی رحلت نے اسٹیٹ کی ساری ذمہ داری ان پر ڈال دی۔ اور اس نوعمر نے ناتجربہ کاری میں حسنِ انتظام کی داد حاصل کر لی اور ایک مقروض جاگیر کو باسرمایہ جاگیر کے رتبہ تک پہنچا دیا۔ ۱۹۳۱ء میں بہادر یار جنگ نے حج کا فریضہ ادا کر کے سارے بلاد اسلامیہ کی سیاحت شروع کی، ملت اسلامیہ کی حالت کا غائر مطالعہ کیا، حجاز و مصر، شام و عراق، ترکی و فلسطین، ایران و افغانستان کے پختہ فکر رہنمایانِ ملت پر اپنی بیدار مغزی، ژرف نگاہی اور دیدہ وری کا سکہ جمایا۔ ختم سفر کر کے یہ ۲۶ سالہ ابن بطوطہ ثانی جب اپنے وطن واپس آیا تو ۱۹۳۲ء میں فکرِ اقبال اس کے سامنے آئی اور اس طرح آئی گویا وہ اسی کی متلاشی تھی۔ بہادر یار جنگ نے اس سے اُنس پایا، اس کو اپنے اندر جذب کر لیا، اس طرح فکرِ اقبال کو ایک صحیح اور کامل تشکل مل گیا، حکمتِ اقبال کی جیتی جاگتی تعبیر نگاہوں کے سامنے

آگئی، اب جو بہادر یار جنگ نے قائد ملت بن کر قوم کو "از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز" کی للکار سنائی تو اہل غفلت چونک اٹھے اور دفعتہً مسلم قوم میں فکر اقبال کی بنیاد پر ایک انقلاب بپا ہوگیا، مردوں میں جان پڑ گئی، پراگندہ متحد ہوگئے، ان میں مقصدیت کا شعور اور منزل کا ہوش پیدا ہوگیا اور وہ اپنی قومی انفرادیت کے قیام کے لیے غیر متزلزل عزم کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔

سن و سال کی یہ تاریخی شہادت اگر بالفرض میسر نہ بھی آتی تب بھی ارباب فہم و دانش سے یہ پوچھنے کا حق تو رہتا ہی اور اب بھی حاصل ہے کہ وہ انصاف سے بتلائیں کہ فکر اقبال کا عملی تعین، تشخص اور تشکل، نہ صرف ہند پاکستان میں بلکہ سارے عالم میں جہاں جہاں تک بھی وہ پھیلی اور پہنچی ہے، بہادر یار جنگ کی مقناطیسی اور ڈرامائی مومن شخصیت کے سوا کہیں اور دکھلایا جا سکتا ہے؟ اگر ہے تو کوئی دکھلائے اقبال کا تصور مرد مومن، اس کا نظریۂ قلندر اور اس کی تمثیل شاہین کا مصداق اگر کوئی اور ہو سکے تو نام لے کر کوئی بتلا دے! ڈھونڈنے والی نگاہ تھک کر عاجز و قاصر رہ جائے گی مگر بہادر یار جنگ کے سوا کوئی اور نہ مل سکے گا۔

جن خوش بختوں نے محض "قائد ملت" یا "لسان الامت" بلکہ بہادر یار جنگ کی مجموعی شخصیت (PERSONALITY) کو قریب سے دیکھا ان کو اقبال کے فلسفۂ خودی یا تصور مرد مومن کے سمجھنے میں کوئی تردد باقی نہیں رہ گیا ع

مے لقائے تو جواب ہر سوال

ورنہ شارحین اقبال کی پراگندہ تعبیریں ایک طالب علم کو کوئی یقینی اور معتبر تصور فکر اقبال

کمانہ عطا کر سکی ہیں نہ کبھی کر سکیں گی۔

جن لوگوں نے بہادر یار جنگ کو دیکھا نہیں اب انہیں کس طرح یقین دلایا جائے کہ جب کبھی ان کی دل فریب و دلربا شخصیت پر نظر پڑتی تھی یا آج بھی اگر وہ تصور میں آجاتے ہیں تو حکیم مشرق کا کلام گویا مجسم ہو کر جگا ہوں میں آجاتا ہے اور ان کی ایک ایک ادا پر ہر ہر اظہار عزم پر اور نو بہ نو اقدام عمل پر اقبال کے اشعار اور قطعات بے ساختہ زبان پر آجاتے تھے، ان کا پُر شکوہ قالب اور ملت کی زبوں حالی پر پگھل پگھل جانے والا دل جب نگاہ کے سامنے ہوتا تھا تو شاعر مشرق کا یہ بے نظیر قطعہ زبان پر آجاتا اور خود اپنے دل میں حرارت و عزم و عمل کی ایسی پُر قوت اکساہٹ پیدا کر جاتا تھا کہ ہزار پند و وعظ سے پیدا ہونا دشوار ہے ؎

تنے پیدا کن از مشت غبارے
تنے محکم تر از سنگین حصارے
درون او دل درد آشنائے
چو جوئے در کہسارے کوہسارے

راقم عاجز نے بہادر یار جنگ سے کبھی پوچھا نہیں کہ تم پچھلی رات کو وہ اپنے مولیٰ سے کس وقت سرگرم راز و نیاز ہو جایا کرتے تھے پر اتنا مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اس معاملہ میں اچھے اچھے دینداروں سے زیادہ چست و چوکس تھے اس کا اندازہ ان کے صبح کے روزانہ معمولات سے ہوتا ہے کہ وہ آہ سحر گاہی سے ہو کر قرآن پاک کی تفاسیر کا مطالعہ تقریباً ایک گھنٹہ کرتے اور پھر نماز فجر کے لیے تشریف لاتے اور بعد نماز حاضرین کو قرآن سے فیضیاب فرماتے تھے۔ ان کے ذوق خلوت اور نالۂ نیم شبی

کا اندازہ اور بزدلوں اور پست ہمتوں کو اپنے استغنائی عمل سے جتلایا کہ ؎

دل بے باک را ضرغام رنگ است
دل ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است
دگر ترسی بہ ہر موجش نہنگ است

اور چلیے، ملت اسلامیہ ہند میں یوں آنے کو کتنے منصب قیادت پر آئے اور آج ہند و پاک نہیں، عالم اسلام میں کتنے ہیں جو آئے ہیں اور آتے رہیں گے، مگر مومنانہ قیادت اور اس کی ظاہری و باطنی، فکری و عملی جامعیت کا جو تصور حکیم مشرق نے پیش کیا تھا اس کا کامل نشکل بہادر یار جنگ کی ذات کے سوا اور کہاں دیکھا جا سکا، وہی اور صرف وہی اُس مومنانہ قیادت کے تصور کا حسین پیکر تھے جو اقبال کے لفظوں میں یوں پیش ہوا ہے ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

اور سنیے، علامہ اقبال نے فرنگی تہذیب و تمدن پر کیسی کیسی کاری ضربیں لگائیں مسلمانوں کو تقلید غیر سے بچنے کی کس شدت سے تاکید فرمائی اور اپنے ورثہ اسلامی کی قدر شناسی کی کتنی پُر زور تلقین کی لیکن اس وقت سے آج تک زمرۂ قیادت میں اس پیام اقبال کا نشکل اور تشخص بہادر یار جنگ کی ذات کے سوا کہیں نظر نہیں آیا؟ وہی ایک شخصیت ایسی تھی جس کے ہر عمل سے دینی غیرت، ملی حمیت اور مغربیت سے تنفر نہ صرف عیاں تھا بلکہ اس کو دیکھ کر ان اقدار کا عملی نفوذ لوگوں میں سرایت کر جاتا تھا اور اقبال کے

اس قطعہ کے پڑھنے میں ایک روحانی کیف محسوس ہوتا تھا ؎

دلا نارائی پروانہ تا کے
نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بہ سوز خویشتن سوز
طواف آتش بیگانہ تا کے

غرض مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں، ہاتھ میں کلام اقبال تھامئے اور نگاہ میں جمال بہادر یار جنگ اور پھر اس کو پڑھتے جائیے اور اس کو دیکھتے جائیے۔ آپ خود کہہ اٹھیں گے کہ یہ بہادر یار جنگ میں "یا تشکل فکر اقبال"؟

"تشکل فکر اقبال" جب تک زندہ و تابندہ رہی، مجلس اتحاد المسلمین ہو یا آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ یا خود مسلم لیگ، ہر جگہ روح اقبال کارفرما رہی، علامہ اقبال قوم کو اپنا پیام دے کر ۱۹۳۸ء میں رحلت فرما گئے مگر چونکہ ان کی ذات میں ان کی فکر کا تشکل تھا اس لیے ملت اسلامیہ ہند کو ان کی رحلت کا نقصان کچھ ایسا محسوس نہ ہوا کلام اقبال اور پیام اقبال پورے آب و تاب سے قوم میں کارفرما رہا، مگر آہ کہ جب ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو اس کا "تشکل" یعنی بہادر یار جنگ ؎

مرد حق افسون ایں دیر کہن
از دو حرف رفی الاعلیٰ شکن

کا نعرہ لگا کر ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گیا تو یکایک یکایک فکر اقبال ایک غیر مرئی حقیقت بن کر رہ گئی، ماند پڑ گئی اور اس کا اثر اہل ملت پر رہا بھی تو بس اتنی ہی دیر اور ایسا ہی بے جان جیسے تیز رفتار برقی پنکھے کا سوئچ بند

ہونے پر اس کی گردش اور ہوا کچھ دیر اثر دکھا کر بند ہو جاتی ہے۔ بہادر یار جنگ کی رحلت کے تین سال بعد پاکستان بن گیا، مگر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس کے بنتے بنتے فکر اقبال کا غلبہ اور اثر اہل ملت کے ذہنوں سے اٹھ چکا تھا اور پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ یہ تلخ یقین فراہم کرتی ہے کہ فکر اقبال بہادر یار جنگ کے ساتھ دفن ہو چکی اور فلسفۂ اقبال ایک قصۂ پارینہ بن چکا۔ اس سے انکار نہیں کہ اقبال کے نام کا ... کوئی ادارہ یا اکیڈیمی آج بھی قائم ہے اور قائم رہے گا، یوم اقبال بھی سال بہ سال منایا جاتا رہے گا، اس کے اشعار بھی سیاسی جماعتیں موقع بہ موقع اپنے نعروں میں قوت پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتی رہیں گی، وہ بھی جو نام نہاد اسلام کی مدعی ہیں اور وہ بھی جو اشتراکی نظام حیات کی ترویج چاہتی ہیں، اقبال کے فلسفۂ خودی اور تصور مرد مومن پر سیکڑوں صفحات سیاہ کیے جا چکے اور اب بھی کیے جائیں گے مگر کاغذ کی ناؤ کسے تیرا سکی ہے جو اب مسلم قوم کو تیرائیگی، زندگی کے سمندر میں تصور اقبال کی عملی ناؤ چلا کر جس نے دکھا دی تھی وہ ناخدا اب واصل بہ خدا ہو چکا، ہزار رحمتیں اس پر اور ہزار سوگ فکر اقبال کا جو بہادر یار جنگ کو کھو کر ایک "حدیث ماتم دلبری" بن کر رہ گئی!!

ان کے اس موثر اور لاجواب جملہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔

"جو لوگ راتوں کو رونا نہیں جانتے دن کو ان کی ہنسی بیماروں کی سی ہنسی معلوم ہوتی ہے۔"

بہادر یار جنگ کی سیرت کا یہ پہلو اقبال کے ان حقیقت افروز اشعار کا کس قدر پر تاثیر تشکل لیے ہوئے ہے ؎

بے آہِ سحر گاہی تقویم خودی مشکل
یہ لالۂ پیکانی خوشتر ہے کنارِ جو

اور یہ کہ ؎

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی طبیعت میں غیرت اسدللہی

بہادر یار جنگ اقبال کے تصور شاہین کا جیتا جاگتا تشخص تھے ان کو اپنے اجداد سے رزق وافر کا جو سامان ملا تھا وہ ملوک و سلاطین کی قصیدہ خوانی کا صلہ نہیں بلکہ مجاہدانہ کارناموں کا صلہ تھا مرحوم کو بجا حق تھا کہ اپنے اجداد کے اس ورثہ سے پوری عزتِ نفس کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور انھوں نے اٹھایا مگر اسی وقت جب تک یہ رزق ان کی بلند پروازی میں ابرِ سیاہ بن کر حائل نہیں ہوا، اور جب وہ حائل ہوتا نظر آیا انھوں نے جاگیر کو ٹھکرا دیا اور پھر تا دم آخر اس کی طرف نگاہ تک نہیں اٹھائی اقبال کا یہ مصرعہ ؎

جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی

کرنے کو تو کسی اور نے بھی اپنی ذات پر بہ زورِ حکومت موزوں کرنا چاہا مگر وقت کے قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ صادر نہیں کیا اس لیے کہ اس کی پرواز تو خود اس کے ہوسِ رزق نے چھین لی تھی چنانچہ ہوس نے اس کو چاہِ مذلت میں ڈھکیل بھی دیا اس کا مصداق تو صرف محمد بہادر خاں تھا

جس نے اپنی آبائی جاگیر اور خطاب سرکاری کو مفادِ ملّت کی راہ میں بلا تامل ٹھکرا کر اپنی پرواز میں اور قوت پیدا کر لی اور کرگس صفتوں کو یہ عملی سبق پڑھایا کہ ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

محترمہ فاطمہ جناح

اسلام کا جانباز سپاہی

موجودہ صدی میں ہمارے جو مشاہیر اسلام گزرے ہیں ان میں ایک حیدر آباد کے بہادر یار جنگ بھی ہیں۔ وہ ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے جن میں کچھ ایسی غیر معمولی کشش تھی جو ان کی نیک نفسی، صداقت و خلوص اور بلند کردار کی آئینہ دار تھی جو شخص بھی ان سے ایک بار مل لیتا ہمیشہ کے لیے اُن کا مدّاح ہو جاتا۔ وہ ایک خداداد حافظے اور ہمہ گیر قابلیت کے انسان تھے۔ تاریخِ اسلام پر انھیں اس قدر عبور حاصل تھا کہ جس کی نظیر شاید مشکل ہی سے ملے گی پھر فن خطابت میں تو وہ ایسا کمال رکھتے تھے کہ ہزاروں کے مجمع کو مسلسل کئی کئی گھنٹے محو رکھ سکتے تھے۔ اپنی نجی اور قومی زندگی میں وہ ہمیشہ بھلائی اور خدمت کے جذبات سے سرشار رہا کرتے تھے۔

یوں تو انھوں نے اپنی زندگی مسلمانانِ دکن کی خدمت کے لیے وقف

کر دی تھی لیکن حصول پاکستان کی جدوجہد میں بھی انھوں نے مقدور بھی کوشش کی مسلم لیگ کی شاید ہی کوئی میٹنگ ہوگی جس میں وہ شریک نہ رہے ہوں ایسی ہونہار اور عظیم المرتبت شخصیت کا عالم شباب میں ہم سے جدا ہونا ایک جانگداز سانحہ تھا لیکن اپنے مختصر عرصۂ حیات ہی میں وہ ایثار اور تحمل صالح کا ایک ایسا پیکر نورانی بن کر چلے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ محض اپنے جذبۂ حریت کی تکمیل اور اعلیٰ اقدار کی تحصیل کی کوشش میں انھوں نے اپنی جان عزیز نذر کر دی۔

ممالک اسلامیہ کے سفر نے ان میں اخوت اور اتحادِ اسلامی کا تخیّل پیدا کیا جس کے وہ آخر تک علمبردار رہے۔ وہ اسلام کے ایک جانباز سپاہی اور وطن کے ایک بطل حریت تھے جن کا شمار ہماری قوم کے سچے خادموں کی صف اول میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ ان ہی کی جلائی ہوئی شمع تھی جس نے حیدرآبادی مسلمانوں کے بچے بچے میں آزادی کی سچی تڑپ پیدا کر دی تھی۔

وہ آج ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کی اعلیٰ شخصیت اور بے مثال خطابت کی یاد آج بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہے۔ بلاشبہ ان کی زندگی میں ہمارے لیے ایک ایسا قابل تقلید نمونہ موجود ہے جسے بلا مبالغہ اقبال کے مردِ مومن سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی سچائی اور اعلیٰ کردار، شخصی زندگی اور قومی خدمات میں آپ کی رہبری کریں گے۔

اے۔ کے فضل الحق

جہادِ آزادی

مرحوم بہادر یار جنگ جیسے عظیم قومی رہنما کی یاد میں خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ میں یہی سمجھتا ہوں کہ اُن ہی کی یادگار تقریر کے اقتباس سے اس مضمون کا آغاز کیا جائے۔ بہادر یار جنگ نے کہا تھا۔

"اگر پاکستان کا سیاسی نظام قرآنی تعلیمات پر مبنی نہ ہو تو میں اس کو ایک سراب سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ میں مانتا ہوں کہ وقت اور حالات منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے میں تغیرات پیدا کر سکتے ہیں لیکن اگر منزل قرآن کی بتلائی ہوئی نہیں تو پھر وہ پستی اور ذلت کی عمیق گہرائیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔"

پاکستان کے بنیادی اصولوں کے بارے میں یہ واضح اور غیر مبہم اعلان بہادر یار جنگ نے ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی میں کیا تھا۔ بہادر یار جنگ کی فعال شخصیت سے ہر وہ شخص متاثر ہوا جس سے ان کو وا۔ ملا۔ ان کو دیکھنے والے مانتے تھے کہ وہ فکر و عمل دونوں میدانوں کے شہسوار ہیں۔

اپنی پیدائش کے اعتبار سے بہادر یار جنگ حیدر آباد کے جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ فہم و فکر کے اعتبار سے وہ علماء کے طبقے سے معلوم ہوتے، اخلاق اور کردار انھیں طبقۂ شرفاء کا رکن ظاہر کرتے، مگر ان کا پُر خلوص دل انھیں

سادہ اور محنت کش عوام کی صفوں میں کھینچ لایا تھا۔
برطانوی ہند میں وہ دور غیر ملکی سامراج کے خلاف ردِّ عمل کا دور تھا۔
جس کا اظہار آزادی کی جدوجہد کی شکل میں ہو رہا تھا۔ مگر ریاست حیدرآباد کے عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ نظام حیدرآباد کی حکومت ان کی اپنی حکومت ہے۔ یہ بہادر یار جنگ کی بصیرت اور دور اندیشی تھی جس نے سب سے پہلے حیدرآباد کے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کو اس غلط فہمی کا احساس دلایا۔ انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ حیدرآباد کا اقتدار اعلیٰ جہاں کی مسلم آبادی کا رہینِ منت ہے اور نظام کا تخت و تاج صرف ان کے اقتدار اعلیٰ کی ایک علامت ہے ان کی آواز نے دکن کے لاکھوں خوابیدہ انسانوں کو بیدار کر دیا۔ انھوں نے ریاست میں مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد رکھی اور ریاست کے طول و عرض میں جا کر اس کی شاخیں قائم کیں۔
برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے یہ دوہری کشمکش کا تھا بہادر یار جنگ نے قائداعظم کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ قائداعظم نے انھیں غیر منقسم ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھیجا اور وہ ہر مرحلہ پر قائداعظم کے معتمد اور دستِ راست بنے رہے۔
بہادر یار جنگ کی بارہویں برسی کے موقع پر ان کے کارناموں کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا بھی مناسب ہوگا کہ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے اسلامی اخلاقیات کے بنیادی اصول دنیا کے سامنے پیش کیے۔ وہ اپنی نجی اور عوامی زندگی میں ایک مذہبی انسان تھے

مذہب کی ہمہ گیر خوبیوں پر ان کا ایمان تھا۔ سیاسی معاملات میں اُن کا رویہ ہمیشہ منافقت اور مصلحت اندیشی سے پاک رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات پر غم منانے والوں میں ان کے سیاسی مخالفین بھی برابر کے شریک تھے۔ وہ بلاشبہ اردو کے عظیم تر مقرر تھے۔

میر لائق علی

مخلص انسان

حیدرآباد کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری نواب بہادر یار جنگ کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے انجمن اتحاد المسلمین کو مسلمانانِ حیدرآباد کا سیاسی مرکز تھا۔

میں بہادر یار جنگ سے اس وقت سے واقف تھا جب میں اسکول جاتا تھا وہ شاید ہم عمر تھے لڑکپن میں وہ بہت موٹے اور بے ڈول جسم کے تھے۔ ان کا تعلق دولتمند اور رئیس گھرانے سے تھا۔ ہم دونوں ہم محلہ تھے۔ مگر ہمارے اسکول مختلف تھے لڑکپن کے اس دور کے بعد پھر میری ان سے ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب کہ وہ ایک زندہ اور فعال سیاسی تحریک کے رہبر بن چکے تھے۔

گرمیوں کی ایک شام ہم دونوں ایک ہی ٹرین میں ہم سفر ہو گئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود وہ میرے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی

معاملہ میرے ساتھ بھی تھا میں نے انھیں لڑکپن کی باتیں یاد دلائیں تو اندازہ ہوا کہ نواب صاحب کو بھی وہ ساری باتیں خوب یاد تھیں وہ ہنس ہنس کر اپنے اس دور کے موٹاپے اور بے ڈول جسم کا ذکر کرنے لگے اور کہا کہ "یہ آپ کی خوش اخلاقی ہے کہ آپ نے اس بات کا ذکر نہیں کیا" اس سفر کے دوران ہم میں بڑی طویل گفتگو ہوئی مگر اس گفتگو میں کوئی سیاسی بحث نہ نکلی۔ اس کے بعد اکثر ہماری ملاقاتیں ہوئیں مگر کسی ملاقات میں بھی کوئی خاص سیاسی موضوع زیر بحث نہ آتا۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے ملکی سیاست سے کوئی دلچسپی ہے یا نہیں۔ میں نے بتلایا کہ مجھے اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور سیاسی، معاشی اور دوسرے مسائل پر گفتگو کرنے لگے۔ ہر ملاقات میں ان کی معاملہ فہمی اور ذہانت سے زیادہ سے زیادہ متاثر ہوتا اور میں یہ سوچ کر حیران رہ جاتا کہ یہ وہی موٹا اور بے ڈول لڑکا ہے جسے ہم بچپن میں تنگ کیا کرتے تھے۔

وہ ایک وجیہہ اور دل فریب شخصیت بن چکے تھے اور نہایت بلند پایہ مقرر۔ انھیں اپنی قوت تقریر پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے سننے والوں کو جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ بعض چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً غذا، لباس اور گھریلو ملازمین کے معاملہ میں وہ بڑے انتہا پسند معلوم ہوتے مگر جہاں اہم مسائل کی بات ہوتی وہ نہایت متوازن اور مخلص انسان ثابت ہوتے۔ بعض اوقات نجی ملاقاتوں میں میں ان کی پبلک پالیسی پر سخت تنقید کر گزرتا مگر وہ کبھی برا نہ مانتے۔ اس کے برخلاف وہ بڑی توجہ اور خلوص سے میرے اعتراضات سنتے اور اکثر میری باتوں پر عمل بھی کرتے تھے۔ ان کے اپنے نظریات اور خیالات ضرور ہوتے مگر وہ دوسرے کا

نقطۂ نظر سننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے اور اپنی کوئی غلطی نظر آجاتی تو فوراً اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ اُن میں یہ جرأت موجود تھی کہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں بحث اور گفتگو میں وہ نہایت وضاحت سے اپنا نقطۂ پیش کرتے اور زیر بحث مسئلے سے کبھی غافل نہ رہتے وہ کبھی غصہ میں آپے سے باہر نہ ہوتے اور اس بات کے سختی سے قائل تھے کہ قومی کاموں کے لیے بڑے پیمانے پر چندے اکٹھا کرنا مناسب نہیں کبھی کبھی وہ چھوٹے چھوٹے چندوں کے لیے میرے پاس آتے۔ یہ وہ موقعے ہوتے جب کہ وہ کسی اسکول یا یتیم خانے کی امداد کے لیے رقم فراہم کر رہے ہوتے یا کسی اور مفید مقصد کے لیے۔ اور یہ مطالبات اتنے مختصر ہوتے کہ انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ بعض اوقات وہ ایک خط لکھ کر مجھ سے رقم کا مطالبہ کرتے اس خط میں رقم کا مصرف نہ بتلایا جاتا۔ مگر اس کے بعد وہ لازمی طور پر اُن سب لوگوں کو جن سے چندہ لیا گیا ہوتا تفصیلی حسابات لکھ بھیجتے۔ یہ اس صورت میں ہوتا جب کہ نواب صاحب کسی غریب کو اس کی بیٹی کی شادی کے سلسلہ میں کسی طالب علم کے تعلیمی اخراجات کی تکمیل کے لیے یا کسی مقروض کی جائداد ضبطی سے بچانے کے لیے رقم فراہم کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ نواب صاحب نے کبھی سیاسی مقصد کے لیے مجھ سے چندہ مانگا ہو۔ ان کاموں میں یا تو وہ اپنی جیب سے خرچ کرتے یا اپنی جماعت کے لوگوں سے حاصل کرتے۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ نواب صاحب نے اپنا سیاسی مشن نہایت ہی محدود مالی وسائل کے ساتھ چلایا اور یہی چیز ان کے سیاسی حریفوں کے لیے ہمیشہ ایک معمہ رہی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کفایت شعاری ہی میں ان کی کامیابی کا راز ہے اور اسی میں مسلم قوم کی نجات ہے۔

ایک رات نواب صاحب چھتاری (جو اس وقت حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے)

کے گھر دعوت میں مدعو تھا کہ وہاں نواب صاحب کے اچانک انتقال کی خبر ملی۔ ہم میں کسی کو اس خبر پر یقین نہ آیا۔ اس خبر کی تصدیق کروائی گئی اور جب تصدیق ہو گئی تو سب دعوت چھوڑ کر نکل پڑے۔ میں اور ملک غلام محمد (وزیر خزانہ حیدرآباد) وہاں سے جائے وقوعہ پر پہنچے۔ وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے بعض لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ میزبان پر سکتہ طاری تھا اور ان کی حالت بڑی ہی قابل رحم تھی۔ بعض زبانوں پر سازش کے امکانات کا ذکر تھا۔ میں اور غلام محمد کوئی ایک گھنٹہ تک وہاں کھڑے رہے مگر ہماری زبانوں سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اس اچانک حادثے نے گویائی سلب کر لی تھی۔

دوسری صبح یہ سوال موضوع بحث بن گیا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کروایا جائے یا نہیں۔ بالآخر طے ہوا کہ پوسٹ مارٹم نہیں ہوگا۔ اس وقت نظام دکن بھی نواب صاحب کے گھر پر موجود تھے۔ نظام دکن لازمی طور پر اہم شخصیتوں کی میت میں موجود رہتے تھے۔

نواب صاحب کی میت کے جلوس میں اتنے لوگ تھے کہ ایسا مجمع حیدرآباد میں کبھی نظر نہ آیا تھا۔ میت میں ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ شریک تھے۔ جلوس کے میلوں لمبے راستے کے اطراف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ گھروں کی چھتوں پر اور دریچوں میں ہر چہرہ اداس اور غمناک نظر آتا تھا۔

بہادر یار جنگ کی تدفین کے ساتھ ہی یہ مسئلہ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا کہ اتحاد المسلمین کی صدارت کون سنبھالے گا۔ اتحاد المسلمین اس وقت ملک کی سیاسی زندگی میں ایک نہایت موثر ادارہ بن چکی تھی۔

اور اس کا صدر یقینی طور پر ملک کی اہم سیاسی شخصیت بن جاتا۔ بہادر یار جنگ دینی مسائل پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور اس میدان میں کوئی عالم بھی انھیں چیلنج نہ کر سکتا تھا۔ ان کی خطابت نے انھیں ریاست، ہندوستان بلکہ مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک میں بھی قابل رشک شہرت کا مالک بنا دیا تھا۔ ان کی دیانت اور خلوص اور ہر شبہ سے بالاتر تھے اور اپنے پرائے سب اس کے معترف تھے۔ مجلس اتحاد المسلمین کو ایک فعال اور موثر ادارہ بنانے اور مسلمانانِ دکن میں سیاسی بیداری اور اعلیٰ تنظیم پیدا کرنے کا کام خود انھوں نے انجام دیا تھا وہ اہم فیصلے کرنے اور اپنی جماعت سے انھیں منوانے کی پوری صلاحیت اور قابلیت رکھتے تھے ان کی زندگی میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو ان سے حسد کرتے تھے مگر کسی میں ان کے مقابل آنے کی جرأت نہ تھی۔ نواب صاحب نے اس منصوبے کو رد کر دیا تھا جو چند اہم شخصیتوں کی سرپرستی میں ابوالحسن سید علی اور ہندو لیڈروں نے مل کر بنایا تھا اور نواب صاحب کے اس فیصلے کی سب نے تائید کی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنی معاملہ فہمی دور اندیشی اور سیاسی سوجھ بوجھ کی بنا پر ہندو مسلم مسئلے کا کوئی دیرپا حل تلاش کرتے رہتے تھے انھیں خوب احساس تھا کہ ریاست حیدرآباد میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندوؤں کو بالآخر ریاست کے انتظام و انصرام میں ان کی تعداد کے مطابق حصہ دینا ہوگا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جب تک دکن کے مسلمان زندگی کے معاشی اور دیگر میدانوں میں خود مکتفی نہ ہو جائیں، بنیادی قسم کی سیاسی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔ ان کا ایقان تھا کہ جب تک مسلمان معاشی اور دیگر معاملوں میں مضبوطی حاصل نہ کر لیں انھیں سیاسی اقتدار سے وابستہ

رہنا چاہیے ورنہ ہندو انھیں معاشی طور پر اپنا غلام بنالیں گے انھیں خوب معلوم تھا کہ ہندو ایک مرتبہ سیاسی قوت حاصل کرلیں تو پھر وہ کسی دوسری قوم کو پنپنے کا موقع نہ دیں گے وہ جانتے تھے کہ جب تک ریاست میں مسلمانوں کی تعداد نہیں بڑھتی وہ ایک موثر اقلیت نہیں بن سکتے۔ نواب صاحب کو ملک کے انتظامی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیوں کی فوری ضرورت کا احساس بھی تھا وہ جانتے تھے اس کے بغیر انتظامیہ کی کارکردگی بہتر نہ ہوسکے گی اور اسی لیے وہ ریاست میں سیاسی اصلاحات کو ضروری بھی سمجھتے تھے مگر ساتھ ہی ان کا اصرار تھا کہ جب تک مسلمانوں کی حالت نہ سنبھل جائے انھیں ملک کی مقننہ میں مساوات حاصل رہے۔ وہ نظام دکن کی شخصی حکومت کے قائل نہ تھے ہر چند کہ وہ اس طرزِ حکومت کی بعض خوبیوں کے قائل ضرور تھے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ اس طرزِ حکومت کی خامیاں خوبیوں سے بہر حال زیادہ ہوتی ہیں اسی لیے وہ حیدرآباد میں جلد سے جلد ایک زیادہ جمہوری نظامِ حکومت کے قیام کے متمنی تھے۔ ہندو نواب صاحب کی بہت سی باتوں کی صداقت کے قائل اور معترف تھے۔ مگر وہ مقننہ میں مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دینے پر تیار نہ تھے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ مساوات غیر منطقی ہے اور وہ یہ مطالبہ نہیں مان سکتے۔ شاید اسی مساوات کو منوانے کے لیے نواب صاحب نے یہ نظریہ پیش کرنا شروع کیا کہ ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ صرف مسلم حکمران کی ذات میں مرکوز نہیں بلکہ ریاست کی ساری مسلم آبادی اس کی حصہ دار ہے۔

وہ آخری دم تک اپنے نظریے پر جمے رہے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً اسی پر قائم رہتے اور اس وقت تک قائم رہتے

جب تک کہ حیدرآباد کے مسلمان اپنی حالت سدھار کر ایک ذی اثر اقلیت نہ بن جائے۔

مجید فاروقی

دل گرمئے نگاہ پاک بنیے، جانِ بے تاب

میں نے قطب مینار دیکھا ہے میں نے جب اس کی بلندی پر پہنچ کر چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے صرف پستی نظر آئی اور جب نیچے آیا تو صرف میری پستی میرے ساتھ تھی۔ ماحول کی ساری پستیاں بلند اور میں پست تھوڑی دیر پہلے کی بلندی فقط سراب، ایک واہمہ، حقیقت صرف پستی، میری اپنی پستی۔

بعض بڑے لوگ بھی قطب مینار کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا قرب ہمیں صرف اپنی پستی کا احساس دلاتا ہے۔ وہ بلند اور ہم پست۔ بلندی ان کی شان اور پستی ہمارا مقدر۔

میں نے محمد بہادر خاں۔ بہادر یار جنگ کو دیکھا ہے۔ میری بینائی کی قسم، میری پستی کی قسم، وہ قطب مینار سے کہیں زیادہ بلند تھے۔ مگر یہ بلندی بھی عجیب تھی کہ ان کے آس پاس دور دور تک کہیں پستی کا گذر نہ تھا۔ ان کے قریب جاکر ہر پست بلند ہو جاتا تھا اسے کبھی اپنی پستی کا احساس نہ ستاتا۔

ہر بلندی کے کچھ ظاہری اسباب ہوتے ہیں۔ دولت، ثروت، حکومت

اقتدار علم و فضل وغیرہ۔

محمد بہادر خاں جاگیر دار تھے۔ صاحب خطاب و اعزاز تھے مگر کیا ان کی بلندی کے یہی اسباب تھے؟ جاننے والے جانتے اور ماننے والے مانتے ہیں کہ جاگیر اور خطاب سے دستبردار ہو کر وہ اور بھی بلند ہو گئے تھے۔

بہادر یار جنگ عظیم مقرر تھے۔ خطابت کے فن نے بہت سے خوش نصیبوں کو بلند بنایا ہے مگر بہادر یار جنگ اپنی رفعت اور بلندی کے عروج کے دور میں ایک سال کے لیے خاموش کر دیئے گئے تھے۔ ان کی سحر طراز اور شعلہ بار زبان بند کر دی گئی تھی۔ اور اب تو اکتیس برس سے وہ بالکل ہی خاموش ہیں مگر کیا اس سکوت نے ان کی بلندی کو کوئی نقصان پہنچایا؟

محمد بہادر خاں بڑے ہی وجیہہ انسان تھے۔ ان کی شخصیت اور وجاہت بڑی ہی دلفریب تھی مگر اس وجیہہ اور دل فریب شخصیت کو ان کے شیدائیوں نے اکتیس برس پہلے شہر حیدرآباد کے ایک محلے آشیر آباد کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

محمد بہادر خاں جاگیر دار خطاب یافتہ تھے۔ انھوں نے جاگیر دار اور خطاب سے دستبرداری حاصل کر لی۔

محمد بہادر خاں عظیم مقرر تھے۔ موت نے ان کی زبان بند کر دی۔

محمد بہادر خاں وجیہہ اور شاندار آدمی تھے۔ انھیں دفن کر دیا گیا۔

سارے ظاہری اسباب ختم ہو گئے مگر بہادر خاں کی رفعت کم نہ ہوئی۔ کیا آج محمد بہادر خاں بلند نہیں ہیں؟ قطب مینار سے بھی زیادہ بلند؟

منبع و سرچشمۂ رفعت و عظمت نے اپنے محبوب ترین بندے کو مژدہ سنایا ورفعنا لک ذکرک۔ یہ رفعت سب سے زیادہ پائیدار ہے،

لازوال ہے۔ اسباب ظاہر سے بے نیاز۔ اب سوچئے کہ اس عبدِ رفیع وارفع کو جو بشارت دی گئی کیا اس کے فیض سے اس کے دامن کے وابستگان، اس کے غلام، اس کے در کے گدا محروم رہ سکتے ہیں؟ میرا ایمان ہے کہ اس رفعت میں ان کا حصہ ضرور ہے۔ پھر یہ تو اس بندے کی بات ہے جو دنیا میں رفعتیں اور عظمتیں لٹانے آیا تھا جس کے در کے گدا شاہنشاہانِ جہاں کے مخدوم بن گئے جس کے فیض نے بلال حبشیؓ کو حسینانِ عرب کا سرتاج بنا دیا۔

محمد بہادر خاں اس بارگاہِ رفیع وارفع کا گدا ہی تو تھا۔ اور کیا تھا؟ ان ہی کے الفاظ میں سنیئے۔ مدینہ منورہ میں مقیم ایک بزرگ کو خط لکھ رہے ہیں۔

"آپ بارگاہِ اقدس پر حاضر ہیں۔ کسی روز میرے لیے نماز فجر کے بعد جالی سے قریب کھڑے ہو جائیے اور عرض کیجئے کہ آپ کا جسم سے دور لیکن دل سے نزدیک غلام طاغوتی طاقتوں کے ساتھ اپنی بے سرو سامانی کے باوجود برسرِ پیکار ہے۔ زمانہ اس سے پھر جائے لیکن آپ کی نگاہِ لطف کے انحراف کو برداشت نہیں کر سکتا بدر کے ساتھیوں کا صدقہ! اُحد کے میدان میں تڑپتے ہوئے حمزہ ابن عبدالمطلب کا تصدق! زرہ چبھی ہوئی پیشانی کا واسطہ! اس کو اپنا سمجھئے اور اپنے سے قریب کر لیجئے۔"

کیا یہ التجا بے اثر ہو سکتی ہے؟ نہیں خدا کی قسم نہیں! اور اگر میں عرض کروں کہ بہادر خاں کی رفعت اور اسی التجا کا جواب تھی تو اس میں کون سا مبالغہ ہے؟

بارگاہِ محمدیؐ سے عطا ہونے والی یہ رفعت محمد بہادر خاں کی ذات میں مجسم اور متشکل ہو گئی تھی اُن کی ہر ادا بلند تھی۔ ان کی ہر بات رفیع، ان کا دل ان کا دماغ، ان کا مزاج سب کچھ بلند تھا۔

چہ باید مرد را طبع بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے

طبع بلند، مشربِ ناب، دل گرم نگاہِ پاک اور جانِ بے تاب، یہ تھا بہادر خاں کا سرمایہ اور یہ سرمایہ وہ اُمتِ مسلمہ میں لٹاتے رہے، اور اس طرح سے لٹایا کہ ایک صدی کا کام صرف پچیس برس میں پورا کر دیا۔ طالب علمی، جاگیرداری سیاحت، تبلیغ دین اور قیادت۔ کسی سرعت سے انھوں نے یہ ساری منزلیں طے کر لیں۔

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک رات میں وہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

بہادر یار جنگ کی حیات اور کارناموں کا تذکرہ یا ان کا جائزہ پیش کرنا میرا منصب ہے اور نہ مجھ میں اس کی اہلیت ہے۔ میں نے بہادر یار جنگ کو پہلے پہل ۱۹۴۰ء میں دیکھا یوم اقبال منایا جا رہا تھا۔ شاید ڈاکٹر یوسف حسین خاں جلسے کے صدر تھے اور نواب صاحب، خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر غلام دستگیر رشید مقرر۔

نواب صاحب سیرۃ النبیؐ کے عظیم شارح کی حیثیت سے نہ صرف حیدرآباد بلکہ ریاست کے باہر بھی مشہور ہو چکے تھے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ شہر حیدرآباد میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اس فساد میں دو نوجوان جن میں ایک نواب صاحب کا بھتیجا تھا۔ بڑی درندگی اور سفاکی سے شہید کیے گئے۔ نواب صاحب نے آمادۂ قتال

مجمع کے سامنے تقریر کی اور فساد کی آگ بجھا دی۔ اس تقریر اور اس کے بعد کی تقریروں کے تذکرے اپنے بزرگوں سے سُنے تھے اور یہی تاثرات لے کر یوم اقبال کے جلسہ میں گیا۔ نواب صاحب نے تقریر کی مگر مایوسی ہوئی نہ جوش نہ جذبات نہ گھن گرج۔ نہ ہی میں زوردار تقریر کا یہ تصور تھا کہ کم از کم مقرر کے منہ سے جھاگ تو اڑے اور یہاں عالمانہ انداز فلسفیانہ ٹھہراؤ۔

ان ہی دنوں مجلس اتحاد المسلمین کے سالانہ اجلاس ہوئے۔ خوش قسمتی سے نواب صاحب کی افتتاحی اور اختتامی تقریر سننے کی سعادت حاصل ہوئی ذہن کی پرورش اور تربیت ہوئی۔ سمجھ میں آیا کہ تقریر کیا ہوتی ہے؟ پتہ چلا کہ مقرر سننے والوں کو کس طرح اپنے آپ سے اور اپنے ماحول سے بے خبر بنا دیتا ہے مبہوت کر دیتا ہے۔

سنہ یاد نہیں شاید مئی کا مہینہ تھا، حیدرآباد میں یہ مہینہ سخت گرمی کا ہوتا ہے اسی مہینہ میں وہاں بے موسم بارشیں ہوتی ہیں۔ ابھی مطلع صاف ہے کہ ابر گھر کر آئے، ٹوٹ کر برسے اور پندرہ منٹ، آدھے گھنٹے میں مطلع صاف۔ غرض اسی مہینے کی ایک رات تھی میلاد النبیؐ کا ایک جلسہ تھا کھلے میدان میں جلسے کا اہتمام تھا مقررین کے لیے اسٹیج پر چھوٹا سا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ رات کوئی ساڑھے دس بجے نواب صاحب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے مشکل سے آدھا گھنٹہ تقریر ہوئی تھی کہ اچانک بارش شروع ہوگئی فطری طور پر لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ نواب صاحب نے للکارا "میں مسلمانوں کی تنظیم پر گفتگو کر رہا ہوں ایسے میں کوئی بدنظمی برداشت نہیں کر سکتا۔" جلسہ گاہ میں سناٹا چھا گیا سب جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے جن کے ساتھ چھتریاں تھیں انھوں نے بھی اپنی چھتریاں بند کر دیں۔ خود نواب صاحب ہاتھ میں مائیکروفون لیے

شامیانے سے میدان میں نکل آئے قریب دو بجے تقریر ختم ہوئی، کسی کو خبر نہ تھی کہ بارش کب تھمی۔

اقبال نے کہا ہے۔

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا
جب سینے کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اس حقیقت کا اظہار تقریروں میں عام طور پر ہوتا ہے۔ مقرر جب جذبات اور زورِ بیان کے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے تو موزوں یا ناموزوں مناسب یا غیر مناسب کی قیود اس کے لیے اکثر بے معنی ہو جاتی ہیں۔ سامعین بھی اس پر کم توجہ دیتے ہیں کیونکہ وہ بھی مقرر کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ مگر میں گنتی کے سبھی چند ایسے حضرات سے واقف ہوں جو نواب صاحب کی تقریریں پوری توجہ سے سنتے تھے کہ کوئی ناموزوں نامناسب لفظ یا فقرہ ان کی تقریر میں دریافت کریں۔ ایسے دو حضرات نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کی کوششیں بے سود رہیں۔

میلاد النبیؐ کا جلسہ تھا۔ نواب صاحب اسلام کے نظریۂ جہاد پر بول رہے تھے۔ عہدِ نبویؐ کے مجاہدین کا ذکر آیا۔ نواب صاحب کی تقریر زورِ بیان کی انتہا کو پہنچ گئی وہ مسلمانوں کو ان کی بے حسی اور راہِ حق سے دوری پر شرم دلا رہے تھے۔ بیان رقت آمیز ہوتا گیا۔ بہت آنکھیں چھلک پڑنے کو تھیں اس لمحہ نواب صاحب نے مصرعہ پڑھا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

جنھیں غالب کا شعر یاد تھا انھیں دھچکا سا لگا کہ یا اللہ یہ کونسا

موقعہ تھا۔ نواب صاحب نے ایک لمحہ کا وقفہ دیا اور شعر مکمل کیا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

تقریر کا مقصود ابلاغ ہے۔ ابلاغ جس قدر مکمل ہوگا تقریر اتنی ہی کامیاب مانی جائے گی۔ اور مقرر اتنا ہی باکمال۔ یہ عرض کروں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ نواب صاحب کی تقریر جانِ ابلاغ ہوتی تھی۔

۳۷-۱۹۳۶ء سے ریاست حیدرآباد میں دستوری اصلاحات کا مطالبہ شروع ہوا۔ سرحد پار سے مظاہرین کی ٹولیاں ریاست میں داخل ہوتیں اور ستیہ گرہ کرتی تھیں۔ دستوری اصلاحات کے اس مطالبہ کا مقصودِ اصل حیدرآبادی مسلمانوں کو ریاست کے اقتدار سے بے دخل کرنا اور مسلمانانِ دکن کے سب سے اعلیٰ اقتدار کے مظہر، والی ریاست میر عثمان علی خاں کو بے بس اور بے اثر بنانا تھا۔ ریاستی حکومت ان دنوں ایسے ہاتھوں میں تھی جنھیں مسلمانانِ دکن سے ہمدردی تھی اور نہ نظام دکن سے۔ غرض اس ایجی ٹیشن کو بہانا بنا کر ریاست میں دستوری اصلاحات کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اس سلسلہ میں سفارشات مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس میں ریاست اور بیرونِ ریاست کے بہترین دستوری قانونی اور سیاسی دماغ شریک تھے۔ کمیٹی نے طویل مباحث کے بعد اپنی ضخیم رپورٹ مرتب کرلی۔ رپورٹ مصطلحات اور پیچیدہ قانونی مباحث کا ایک شاہکار تھی۔ مسلمانانِ دکن کو ان پس پردہ سازشوں کا علم تو خاک اس کا احساس کہ ان کے لیے کس اہتمام سے قبر کھودی جارہی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانوں کو رپورٹ کے مالہ و ماعلیہ سے آگاہ کرنے کے لیے تین عام جلسوں

اہتمام کیا۔ نواب صاحب ان دنوں سخت نزلہ اور بخار میں مبتلا تھے۔ مگر تینوں جلسوں میں مجموعی طور پر کوئی نو دس گھنٹے تقریر کی۔ دوسروں کی نہیں اپنی عرض کروں کہ ان دنوں میٹرک کا طالب علم تھا۔ کمیٹی کی رپورٹ صحیح طور پر پڑھنے کی بھی صلاحیت نہ تھی۔ مگر نواب صاحب کی تین تقریریں سننے کے بعد یہ اعتماد پیدا ہو گیا کہ میں رپورٹ کے نتائج پر کسی سے بحث کر سکتا ہوں۔ یہ بات ان لوگوں پر بھی صادق آتی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

رپورٹ کی سفارشات کی مخالفت میں نواب صاحب نے مظاہرے کروائے اور نہ ہڑتال، نہ کوئی جلوس۔ بس مسلمانان دکن کے شعور کو بیدار کر دیا اور اس بیداری کا اثر دنیا نے دیکھ لیا کہ کمیٹی کو اپنی سفارشات بدلنی پڑیں۔

زبان و بیان پر عبور، جاندار اور دلکش آواز، مقرر کی شخصیت اور دو جاہت۔ اس کا علم اور تقریر مقرر کو کامیاب بناتے ہیں۔ مگر کیا صرف یہی چیزیں محویت اور اثر کے وہ کمالات دکھلا سکتی ہیں جو بہادر یار جنگ کی تقریروں میں نظر آتے تھے۔ ان کی خطابت کی کامیابی کا راز اس سے آگے بڑھ کر کہیں ڈھونڈنا ہوگا۔ نواب محمد بہادر خاں کے استاد اور مرشد معنوی حکیم الامت علامہ اقبال اس راز کی کچھ یوں نشاندہی کرتے ہیں ؎

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے
جس روز دل کے رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

رموز دل سے آگہی قلب و دماغ کو بیدار کرتی ہے اور بہادر یار جنگ کے قلب بیدار کی تو قسم بھی کھائی جا سکتی ہے۔

اختلافات کو اگر میں شجر سیاست کی کھاد کہوں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اختلافات کے بغیر سیاست کا فروغ ہی محال ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اختلافات کے بارے میں ایک سیاسی رہنما کا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ سیرۃ محمدیؐ میں اس کا جواب موجود ہے مگر ہم نے اسے یاد کب رکھا ہے۔ اس موضوع پر بات کرنے کا نہ اہل ہوں نہ اس کی جرأت رکھتا ہوں مجھے تو محمد بہادر خاں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

۱۹۴۱ء میں حیدرآباد میں مردم شماری ہو رہی تھی۔ سیاسی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ نواب صاحب نے مجلس کے پلیٹ فارم سے قرارداد پیش کی کہ مسلمان مذہب کے خانے میں صرف اسلام لکھوائیں فرقوں کی وضاحت نہ کریں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ فرقوں کی تقسیم مسلمانوں کی عددی اقلیت کو اور بھی نہ گھٹا دے۔ مگر بدقسمتی سے اس کا کچھ اور مطلب لیا گیا۔ نواب صاحب کی مخالفت شروع ہوئی، اس میں کچھ علماء بھی شامل ہو گئے۔ تہمت تراشی کے دفتر کھلے۔ نواب صاحب کے ہم خیال اور حامی جو بلاشبہ اکثریت میں تھے اس صورت حال سے فطری طور پر سخت برہم تھے۔ جوابی کارروائی کے منصوبے بننے لگے۔ یہ لوگ حق پر تھے۔ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ وہ مخالفین کے منہ بند کر سکتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ نواب صاحب کی ذات ہدف ملامت بنائی جا رہی ہے۔ مگر خود نواب صاحب نے اپنے مخالفین کے جواب میں نہ ایک لفظ کہا اور نہ اپنے حامیوں

کو لب کشائی کی اجازت دی۔

نواب صاحب ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ دوران تقریر کلام اللہ کی ایک آیت پڑھی۔ کہنے لگے آج تلاوت کر رہا تھا۔ اسی آیت پر پہنچا تو ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ گویا آیت مجھ پر نازل ہو گئی ہو۔ حیدرآباد کے ایک معمر صحافی جو بجا طور پر دکن کے بابائے صحافت کہلائے جا سکتے تھے اس پر چراغ پا ہو گئے اپنے اخبار میں ایک نہایت تلخ اداریہ لکھ ڈالا۔ اب محمد بہادر خاں الہام کے بھی دعوے کرنے لگے۔ دیکھئے کب اپنی نبوت اور رسالت کا اعلان کرتے ہیں۔

کجا بود مرکب کجا تاختم

اداریہ پڑھنے والوں کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ ان ہی دنوں مجلس اتحاد المسلمین کے اجلاس منعقد ہوئے۔ ایک اجلاس میں نواب صاحب کے ایک رفیق مسلمانان دکن کی سیاست اور دکن کی صحافت پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ دوران تقریر وہ اس اداریے کی طرف آنے لگے۔ مگر ابھی صرف اشارہ ہی کیا تھا کہ نواب صاحب نے جو صدر جلسہ تھے انھیں ٹوک دیا اور کہا "آپ ان کے متعلق کچھ نہ کہیں۔ وہ ہمارے بزرگ ہیں۔

نواب میر اکبر علی خاں حیدرآباد کے ایک جاگیردار اور بیرسٹر تھے سخت قسم کے قوم پرست مگر نواب صاحب کے بچپن کے دوست اور ساتھی سیاست کے میدان میں دونوں کا ٹکراؤ ناگزیر تھا۔ ایک ایسے ہی ٹکراؤ کے موقع پر میر اکبر علی خاں نے نواب صاحب کو ایک شکایت آمیز خط لکھا۔ نواب صاحب انھیں جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میرے بھائی! آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی دیانتداری اور اخلاص میں نہ مجھے پہلے شبہ تھا نہ اب ہے۔ میرا اور آپ کا مسلک کا اختلاف باقی رہے گا۔ اگر ضرورت پیش آئی تو آپ پر علی الاعلان سخت سے سخت تنقید کروں گا اور اگر آپ اس سے رنجیدہ بھی ہوں گے تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔"

میں نے حیات بہادر یار جنگ کے بیان میں اپنے علم، اپنی عقل اور اپنے ظرف کے مطابق چھوٹی چھوٹی باتوں پر اکتفا کیا ہے۔ مگر اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوں۔ میں نے بہادر یار جنگ سے سیرۃ طیبہ پر کئی تقریریں سنیں۔ ان تقریروں نے یہ سبق دیا کہ آدمی کو چھوٹی چھوٹی باتیں ہی بڑا بناتی ہیں۔ معجزے اور کرامتیں نہیں۔ میرے رسولؐ سے معجزے طلب کیے جاتے تو جواب ملتا معجزے کیوں؟ کیا تمہارے سامنے میری چالیس سالہ زندگی نہیں ہے؟" اور یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ محمد بہادر خاں صرف اور صرف محمدؐ عربی کا غلام تھا۔ یہی اس کی دل کشی اور دلفریبی کا راز تھا۔ یہی اس کی عظمت اور رفعت کا سرمایہ تھا۔

خداوندا! ہمیں بھی بہادر یار جنگ کا اخلاص عطا کر۔ وہ ظرف دے کہ ہم صحیح معنوں میں محمد عربی کے غلام بن سکیں ؎

دلوں سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینے میں بیدار کر

الحاج محمد زبیر

بہادر یار جنگ اپنی تحریروں کی روشنی میں

میں نے قائدِ ملت بہادر یار جنگ مرحوم کا نام پہلے پہل خاکسار تحریک کے ضمن میں سنا تھا اس تحریک کے انتہائی اور سخت اور کڑے اصولوں کی جس خلوص و تندہی کے ساتھ انھوں نے پابندی اور تعمیل کی، اس کا شہرہ سن کر میں ان کی بڑائی کا قائل ہو گیا اور میرے دل میں ان کو دیکھنے کی آرزو کروٹیں لینے لگی۔ میری یہ آرزو اس وقت بر آئی جب وہ پاکستان تحریک کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے اور اسٹوڈنٹس یونین کلب کے عظیم الشان ہال میں ان کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا مجھے وہ سماں خوب یاد ہے جب قائدِ ملت تقریر کرنے کے لیے اسٹیج پر تشریف لائے تو یکایک یونین ہال کی چھت کے دریچہ سے ان پر پھول برسنے لگے اس گل باری سے ان کا متبسم اور پروقار چہرہ بے حد مسرور اور شگفتہ نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے پرجوش تالیوں کی گونج میں اپنی تقریر کا آغاز کیا اور طاقتِ لسانی اور حسنِ خطابت کا سکہ حاضرین کے دلوں پر بٹھا دیا اس کے بعد وہ برابر علی گڑھ تشریف لاتے رہے اور مجھے ان کی خدمت میں باریاب ہونے اور ان کی بلند پایہ تقاریر سننے کے مواقع ملتے رہے ان جلسوں میں میری بیوی بھی برابر شریک ہوا کرتی تھیں جلسہ گاہ میں یونیورسٹی اسٹاف اور طلباء کے علاوہ خواتین بھی کافی تعداد میں ہوتی تھیں۔ ان جلسوں کی

ایک قابلِ قدر خصوصیت یہ تھی کہ خواتین کے لیے نشستیں مردوں سے علیحدہ ہال کی گیلری میں فراہم کی جاتی تھیں۔

میں نے نواب صاحب کی تقریر میں ایک خوبی یہ بھی دیکھی کہ وہ تقریر کے دوران بڑے فاضلانہ انداز سے بڑی اچھوتی اور نئی بات پیدا کر کے اپنے بیان کو دلکش اور پُر مغز بنا دیتے تھے۔ مثلاً ایک بار مسلم لیگ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس کا اولین اجلاس اللہ تعالیٰ کے زیرِ صدارت آسمان پر ہوا تھا پھر انھوں نے اپنے اس نکتہ کی توضیح و تشریح نہایت پُر تاثیر اور عالمانہ انداز سے فرمائی جس کے نقوش مدتوں میرے ذہن کی سطح پر مرتسم رہے۔

یہاں یہ کہہ دینا غیر متعلق نہ ہوگا کہ طلباء کے یونین کلب کا یہ ہال نواب حامد علی خاں والیٔ رامپور کے قیمتی عطیہ سے تعمیر ہوا ہے اور اسی بناء پر "رام پور حامد ہال" کہلاتا ہے۔ یہاں ہر ملک و قوم کے اکابر و مشاہیر کے طلباء کی طرف سے خیر مقدم کیے جاتے ہیں جن کی شان و شوکت لائقِ دید ہوتی ہے لیکن جب نواب بہادر یار جنگ کے جلسوں میں شرکاء کی تعداد ہال کے وسعت سے آگے نکل گئی تو ان کی تقریریں یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں ہونے لگیں۔

اس ہال کے متعلق یہ یاد رہے کہ اس کے در و بام میں ایثار و قربانی فراخدلی اور بے تعصبی کے بڑے دلکش نقوش تقریباً سو برس سے جھلک رہے ہیں ان کا ذکر میں اپنی تحریروں اور تقریروں میں کرتا رہتا ہوں تاکہ سامعین اور قارئین کے دلوں میں یہ عالی صفات اجاگر ہوتی رہیں۔

اس عظیم الشان ہال کی اندرونی وسعت پانچ ہزار مربع فٹ کی

جاتی ہے۔ اس کا نام سرسید نے اپنے زمانے کے یوپی کے گورنر "سرجان اسٹریچی" کے نام پر اسٹریچی ہال رکھا تھا۔ اور آج تک وہ اسی نام سے موسوم ہے۔ اس کی دیواروں پر ان اصحاب کے کتبے ہیں جنھوں نے اس کی تعمیر میں چندے دیئے تھے ان میں مسلم معطیان کے ساتھ ہندو اور انگریزوں کے نام بھی ثبت ہیں۔ مگر ان میں جالندھر ہائی اسکول کے ایک غریب مدرس کا نام سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ ان کے ایثار کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی لڑکی کی شادی کے لیے پانچسو روپے جمع کیے تھے لیکن نکاح کے وقت اسے خیال آیا کہ شادی کی فضول رسموں میں خرچ کرنے کے بجائے قومی کام میں خرچ کر دینا بہتر ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی لڑکی کا نکاح صرف چھواروں پر کر دیا اور پانچ سو روپے اسٹریچی ہال پر تعمیر کرنے کے لیے سرسید کے پاس بھیج دیئے۔

یہ ذکر تو درمیان میں آگیا جس کا پڑھنا میرے خیال میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اصل میں کہنا یہ ہے کہ اس عالی شان ہال میں یونیورسٹی کانوکیشن اور دیگر بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں یہاں میں نے ہز اکزالٹڈ ہائنس میر عثمان علی خاں (نظام حیدرآباد دکن) ہز ہائنس سلطان جہاں بیگم نواب حمید اللہ خاں (فرماں روایان بھوپال) نواب صاحب بہاول پور، مہاراجہ الور، وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو، لارڈ ولنگٹن اور دیگر ممتاز اکابر کے بڑے تزک و احتشام سے خیر مقدم ہوتے دیکھے ہیں لیکن جب بہادر یار جنگ یہاں تقریر فرماتے تو یہاں کا سماں بڑا روح افزا ہو جاتا۔ ان جلسوں کی مقبولیت اور نواب صاحب کی ذات گرامی سے لوگوں کی ارادت کا یہ عالم دیکھا کہ

یونیورسٹی کے پروفیسر طالب علم غرض ہر استعداد اور ہر مکتب فکر کے حاملین اتنی کثیر تعداد میں شریک ہوتے کہ اس وسیع ہال میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہتی جب نواب صاحب ارکین یونیورسٹی کے جلو میں یہاں داخل ہوتے تو حاضرین ایستادہ ہو کر پُر جوش چیرز کے ساتھ اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے تھے۔

ایسے ہی والہانہ جوش و خروش کے ساتھ اُن کی آمد کے وقت اسٹیشن پر اُن کا استقبال کیا جاتا طلباء اور دیگر حضرات کی اس قدر کثرت ہوتی کہ ریل کا وقت مقررہ پر روانہ ہونا مشکل ہو جاتا۔ ایک بار میں لوگوں کے جم غفیر میں اس بری طرح پھنسا کہ سانس لینا محال ہو گیا اس کے بعد پھر کبھی ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن جانے کی ہمت نہ ہوی۔

یہ ۳۵ برس پرانی باتیں ہیں جو یاد آجاتی ہیں وہ یہاں پیش کر دیتا ہوں اس وقت میری نظروں میں وہ چہل پہل اور رونقیں گھوم رہی ہیں جو نواب صاحب کے قیام کے دوران یونیورسٹی سے شہر تک پھیل جایا کرتی تھیں شہر کے لوگ بھی ان کی تقریریں سننے کے لئے متمنی رہتے کہ رات میں بھی کئی میل کا فاصلہ طے کر کے یونیورسٹی پہنچ جاتے تھے۔

علی گڑھ میں جہاں ان کا قیام ہوتا وہاں بھی ہمہ وقت چہل پہل رہتی ان سے ملنے اور ان کی صحبتوں سے فیض اٹھانے کے لیے لوگ برابر آتے رہتے تھے۔ لائق ذکر بات یہ ہے کہ ان مشاغل کے ہجوم میں بھی ان کے چہرہ پر تھکن یا گھٹن کے آثار نہ ہوتے ہر حال میں ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ ان کی مصروفیت کا حال کیا بیان کروں۔ یونیورسٹی کی شعبہ جاتی سوسائیٹیوں

اور طلباء کی مختلف انجمنوں کی طرف سے روزانہ عصرانے اور ڈنر دیئے جاتے ان تقریبات میں نواب صاحب کی شان میں نظمیں پڑھی جاتیں، مہمان اپنی تقریروں میں طرح طرح سے ان کی خدمات کی تعریف و تحسین کرتے پھر نواب صاحب کی جوابی تقریر ہوتی جو کھانے کے مزوں کو دوبالا کر دیتی ان تقریبات میں مجھے جب اپنی شرکت یاد آتی ہے تو علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھ کر دل ٹھنڈا کر لیا کرتا ہوں ؎

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک جلیل القدر مقرر تھے میں نے یونیورسٹی سے اپنی ۴۲ سالہ وابستگی کے دوران جن بڑے بڑے علماء و فضلاء اور اکابر مشاہیر کی تقریریں سنیں ان میں نواب صاحب کی تقریر کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس کی لطافت اور شیرینی و شگفتگی ہی کچھ اور تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہادر یار جنگ جیسی جامع صفات شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ خدا نے انھیں بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ اتنی اعلیٰ صفات کے مالک تھے جنھیں بیان کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی لیکن میں یہاں چند ایسی تحریریں پیش کروں گا جن سے ان کی زندگی کے امتیازی و خصوصی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور جو اس امر کی آئینہ داری کر رہی ہیں کہ وہ اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے اور آنحضرت صلعم کی ذات اقدس سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور یہ دونوں جذبات عالیہ ان کے ہر عمل میں روح کی طرح کام کرتے رہتے تھے۔

انھوں نے پاکستان تحریک کو فروغ دینے میں جس خلوص و تندہی سے حصہ لیا تھا اس کی وجہ بھی یہ ہی تھی کہ وہ اسلام کے بڑے شیدائی تھے ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ اسلام کے بڑے شیدائی تھے ان کی دلی تمنا تھی کہ ایک ایسی مملکت برصغیر کے اندر بنائی جائے جہاں اسلامی آئین و قوانین نافذ ہوں ایسی سلطنت کے قیام کا منصوبہ دیکھ کر انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ کہہ دیا تھا کہ:

"میرے خیال میں پاکستان کے لیے ہر قسم کی سعی و کوشش حرام ہے اگر پاکستان سے الٰہی اور قرآنی حکومت مراد نہیں جس میں قانون سازی کا بنیادی حق صرف خدائے قدوس کو حاصل ہو، اور ہمارے بنائے ہوئے قوانین اس کی توضیح و تشریح کریں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"میں زندگی کے ہر گوشہ اور حیات کے ہر پہلو کے لیے قرآن کے نظام کو کافی و شافی سمجھتا ہوں۔"

اگر آج وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کی مندرجہ بالا امید ابھی تک بر نہیں آئی اور پاکستان کے کسی گوشہ میں قرآنی نظام قائم نہیں ہو سکا۔ یہ دیکھ کر بھی انھیں بڑا ملال ہوتا کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی مملکت میں فحاشی موسیقی و رقاصی اور دیگر غیر اسلامی طور طریقے رواج پا رہے ہیں اور "اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے حالانکہ قرآن میں اس فریضہ کو ادا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے (دیکھیے سورۃ

آل عمران ۱۱) ایسے ماحول میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملک معاشرہ وہ اسلامی صورت کب تک اختیار کر سکے گا جسے دیکھنے کی بہادر یار جنگ کو بڑی تمنا تھی۔

بہادر یار جنگ مرحوم اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے، اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے دل سے خواہاں تھے۔ قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام (حیدرآباد دکن) کو لکھتے ہیں۔

"میری گزشتہ تقریر سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ میں نے اسلام کا دولت اور اس کی تقسیم سے متعلق کس نظریہ سے مطالعہ کیا ہے۔ میں اول اور آخر مسلمان ہوں، چاہتا ہوں کہ اسلام کو دنیا کے ہر دور میں انسانوں کا مقصد حیات دیکھوں اشتراکیت کا میں نے بہ نظر عمیق مطالعہ کیا ہے اور یقین رکھتا ہوں کہ اسلام کو اگر صحیح طور پر پیش کیا جائے تو وہ اشتراکیت کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور مکمل نظام حیات بن سکے گا۔"

وہ اسلام اور انسانیت کو مترادف سمجھتے تھے اور اسی لیے اپنی محبت کے دائرے کو صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کو وسعت دے کر پوری نوع انسانی پر محیط کر دینا چاہتے تھے چنانچہ ایک موقع پر اپنے اس عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مجھے اپنی قوم سے محبت ہے کسی اور سے نفرت نہیں میری اپنی قوم سے محبت مجھے بنی نوع انسان کی خدمت پر مجبور کرتی ہے اور کہتی ہے اسلام محض مسلمانوں کی خدمت نہیں سکھاتا اور صرف

مسلم مفاد کا سبق نہیں دیتا، ہمارا خدا سب کا خدا ہے مسلمانوں کا اور غیر مسلمان کا، سچے انسان بننے کے لیے سچے مسلمان بننے کی ضرورت ہے۔"

یہ باتیں محض الفاظ ہی کی حد تک نہیں تھیں بلکہ زندگی بھر نواب صاحب اس اصول کو اپنے عمل کی کسوٹی بنائے رہے۔ انھوں نے بارہا ہمدردی اور محبت کا اظہار غیر مسلموں کے ساتھ کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ ایک سچے اور پکے مسلمان کا کردار کیا ہوتا ہے۔ حیات بہادر یار جنگ کے مولف مولانا غلام محمد، پروفیسر غلام دستگیر کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"ایک دن مرحوم کی محفل جمی ہوی تھی اور وہ اپنی دائمی بشاشت کے ساتھ کلام فرما رہے تھے کہ ایسے میں ایک غریب ہندو عورت اپنے لڑکے کو لیے ہوے حاضر ہوی اور بہت ہی لجاجت سے کہنے لگی میں غربت سے مر رہی ہوں یہ میرا لڑکا اسی سال میٹرک پاس کر چکا ہے اگر آپ کوشش فرما دیں تو کہیں ملازمت مل جائیگی آپ کے سوا اب میرا کون ہے۔"

مرحوم اتنے متاثر ہوے کہ فوراً ٹیلیفون اٹھا کر سفارش فرما دی اور اس عورت سے کہہ دیا کہ انشاء اللہ بہت جلد نوکری مل جائے گی۔ تم چلی جاؤ عورت ابھی دروازہ سے باہر بھی نہ ہوی تھی کہ مرحوم اشک بار ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں سسکیاں بندھ گئیں اور اپنے رب کی بارگاہ میں گڑگڑا کر فریاد کرنے لگے:

"بار الہ یہ تیرا گنہگار اور عاجز بندہ۔ اس سے تیری خلق کی کیا خدمت ہو سکتی ہے اس میں طاقت ہی کیا ہے۔"

اسی انسان دوستی، رواداری، حسن سلوک اور انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ مرحوم اغیار کی اچھی باتوں کا اعتراف کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور کسی کے اعتراض کی پرواہ کیے بغیر دل کھول کر ان کی تعریف کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی سیاحت کے دوران یہودیوں کے مرکزی شہر "تل ابیب" میں جو کچھ دیکھا اسے حق اور انصاف کے بلا تکلف بیان کر دیا اور اس امر کا قطعاً خیال نہ کیا کہ یہودیوں کو مسلمان پسند نہیں کرتے۔ سفرنامہ میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"میں نے تل ابیب دیکھا اور اس کی موزونیت اور خوشحالی سے متاثر ہوا میں نے اس شہر کے کتب خانہ کی بھی سیر کی جس میں اس وقت تک دو لاکھ کے قریب کتابیں جمع ہو چکی ہیں مجھے یہاں عربی لغت کی ترتیب و تدوین کا بھی علم ہوا جسے آٹھ سال کی محنت شاقہ کے بعد یہودی اہل علم حرف ج تک پہنچا سکے ہیں میرا یہ خیال ہے کہ یہودیوں کا فلسطین سے اخراج اتنا آسان نہیں جتنا کہ عربوں نے سمجھ رکھا ہے۔"

بہادر یار جنگ کا ایک اہم وصف ان کا عشق رسول تھا اس سے وہ پوری طرح سرشار تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ لطف و کرم کو اپنے لیے سرمایہ حیات سمجھتے تھے حکیم غلام احمد المدنی سے نہایت والہانہ انداز میں درخواست کرتے ہیں:

"آپ بارگاہ رسالت پر کسی روز میرے لیے نماز فجر کے بعد جالی کے قریب کھڑے ہو جائیے اور عرض کیجیے کہ آپ کا ایک غلام جو جسماً دور اور قلباً قریب ہے طاغوتی طاقتوں سے اپنی بے سروسامانی کے

باوجود معروف پیکار ہے زمانہ اس سے پھر جائے لیکن آپ کی نگاہِ لطف کے انحراف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بدر کے ساتھیوں کا صدقہ، احد کے میدان میں تڑپتے ہوئے حمزہ ابن عبد المطلب کا تصدق، زرہ جھنتی پیشانی کا واسطہ اس غلام کو اپنا سمجھئے اور اپنے سے قریب کر لیجئے۔"

مرحوم اپنی ہر تقریر میں کسی نہ کسی اعتبار سے سیرت طیبہ پر روشنی ڈالتے تھے اور جب دوران تقریر رسول اکرمؐ کا ذکر آجاتا تو ان کا جوش حد سے فزوں ہو جاتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یکایک کسی دریا میں تلاطم برپا ہو گیا ہے اس ذکرِ جمیل سے مرحوم کا ایک ایک عضو متاثر ہو جاتا اور تقریر کا ہر لفظ سننے والوں کو بھی مسحور اور متاثر کرتا جاتا تھا خود مرحوم کے کام و دہن ذکرِ حبیب سے اس درجہ لذت یاب ہوتے تھے کہ تقریر کے کافی دیر بعد تک کسی سے بات نہیں کر سکتے تھے اور انھیں کے تصور میں گم رہتے تھے۔

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے خود کو آپ ہی کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی جزئیات کی حد تک وہ رسول اکرمؐ کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ مرحوم بہادر یار بھی اس معاملہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی پیروی کرتے تھے انھوں نے ادعیہ ماثورہ اس کثرت سے یاد رکھی تھیں کہ بقول عبد الماجد دریا بادی:

"لوگ مجھے عالم مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے ہیں یہاں تو ان کی آدھی دعائیں بھی یاد نہیں۔"

بہادر یار جنگ کا اتباع سنت کے معاملہ میں یہ حال تھا کہ کپڑے

ہنستے ہوئے گھر سے باہر نکلتے ہوئے سواری پر سوار ہوتے ہوئے ہر ہر موقع پر ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے اور وہ ہی الفاظ سنائی دیتے تھے جو ان موقعوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلتے تھے۔ اس قدر تواتر سے دعاؤں کا ورد کرتے دیکھ کر مولانا عبد الماجد دریابادی بے ساختہ کہہ اٹھے:

"یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصن حصین قسم کی کوئی کتاب ہے"

پھر عشق رسول صرف زبانی حد تک نہ تھا بلکہ اس کا اظہار مرحوم کے ایک ایک فعل اور عمل سے ہوتا تھا۔ انھوں نے خود بھی سیرت طیبہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور دوسروں کے لیے بھی ان کا یہی خیال تھا کہ "سیرت طیبہ پر غائر نظر ڈالے بغیر قرآن کی حقیقی فہم حاصل نہیں ہو سکتی۔" ان کی نصیحت کا خلاصہ علامہ اقبال کے اس ایک شعر میں جھلکتا ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

وہ مسلمانوں کی ترقی کے دل سے خواہاں تھے اور اپنی اس خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کرتے تھے۔

"میری تمنا ہے کہ ہر مسلمان کو دولت کے اعتبار سے، علم کے اعتبار سے، تقویٰ کے اعتبار سے اور حکومت کے اعتبار سے دنیا میں سب سے آگے دیکھوں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس تمنا کی تکمیل میں صرف حیدر آباد کے ۱۵ لاکھ مسلمانوں کے لیے نہیں چاہتا بلکہ اس میں ہندوستان کے نو کروڑ اور دنیا کے چالیس کروڑ مسلمان شامل ہیں۔"

بہادر یار جنگ صحیح معنوں میں قومی خدمت گار تھے وہ اس لیے قوم کی خدمت و قیادت نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کی عزت و تعظیم کریں اور اور ان کے لیے آسائش و آرام کے سامان مہیا کیے جائیں ان کا کہنا تھا۔

"آج ملّت کو ان افراد کی ضرورت نہیں جو شجر ملّت پر پھول بن کر چمکنا چاہتے ہیں، اور پھول بن کر کام و دہن کی لذّت بننا چاہتے ہیں ہمیں ان افراد کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہو جائیں شجر ملّت کی جڑ کو مضبوط بنائیں مٹی اور پانی میں شیرینی پیدا کریں۔ ہم کو ان افراد کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر چشم و نظارہ کو خیرہ کرنا چاہتے ہیں ملّت کو ان بنیاد کے پتھروں کی ضرورت ہے جو ہمیشہ کے لیے زیر زمین دفن ہو کر استحکام کی ضمانت دے سکیں۔"

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

مرحوم ایک دولت مند جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت کمسنی میں تمام املاک کے مالک بنے نوابی کا خطاب عطا ہوا، عیش و آرام کے تمام سامان ان کو میسّر تھے ایسی صورت میں قید و بند کی صعوبات کو بخوشی برداشت کرنا ان کے لیے ایک نالوس سی بات تھی لیکن انھوں نے قومی کارکنوں کے لیے جن اوصاف کو سطور بالا میں ضروری بتایا ہے ان ہی کو وہ اپنے لیے بھی پسند کرتے تھے سید محمود عالم کو لکھتے ہیں:

"آپ کہتے ہیں کہ خدانخواستہ جیل جانے کی نوبت نہ آئے اور

میں کہتا ہوں کہ اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں بن سکے گا
برادرِ محترم آپ کو یقین نہ کرنے کا اختیار ہے لیکن گواہ رہیے
کہ بہادر خاں کے ہاتھ ہتھکڑیوں کے، پاؤں بیڑیوں کے، گردن
طوق کی اور سینہ گولیوں کا منتظر ہے آپ نے مجبوراً کہلوایا ورنہ
ان تمناؤں کا زبان پر آنا لطفِ تصور کو گھٹا دیتا ہے۔"

جب ان کو جاگیر اور خطاب کے چھین لیے جانے کی دھمکی دی گئی تو جس خندہ پیشانی سے اسے برداشت کیا وہ ان ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

"مجھے دھمکایا جا رہا ہے کہ میری جاگیرات و خطابات چھین لیے جائیں گے مجھے ڈرایا جا رہا ہے کہ شہر بدر کر دیا جائے گا۔ جہاں تک جاگیرات کا تعلق ہے میں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ نہ جان میری ہے اور نہ مال میرا، سب اللہ کا ہے اِنَّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔ رہا خطاب کا سوال جب میں پیدا ہوا تھا میرا نام ماں باپ نے محمد بہادر خاں رکھا اور آپ کی عنایت سے ۱۸ سال سے نواب بہادر یار جنگ کے خطاب سے پکارا جا رہا ہوں اور محمد کی وابستگی سے محروم کر دیا گیا ہوں بڑا اچھا ہوا کہ وہ محبوب و متبرک نام پھر سے میرے ساتھ ہے لہٰذا اس کا مجھے ملال کیوں ہو۔"

بہادر یار جنگ کی زبان دکنی تھی لیکن ان کو قدرت نے یہ صلاحیت عطا فرمائی تھی کہ وہ دوسری زبانوں کو بڑی آسانی سے سیکھ لیتے تھے چنانچہ انھوں نے کئی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا اور اردو زبان و ادب پر تو

انھوں نے اس درجہ قدرت حاصل کر لی تھی کہ ان کی اردو تحریر و تقریر دوسروں کے لیے قابل رشک بن گئی اس زبان سے انھیں اس درجہ انس تھا کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اس کا بولنا اور لکھنا نہایت ضروری سمجھتے تھے اگر کوئی انگریزی میں تقریر کرتا یا خط لکھتا تو انھیں سخت ناگوار ہوتا۔ عائشہ حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مسلم لیگ کی ایک خاتون نائب صدر کی حیثیت سے مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ ایک غیر ہندوستانی زبان میں مخاطب کریں گی اعتراضاً نہیں بلکہ احتجاجاً عرض کر رہا ہوں۔"

ایک خط میں اورنگ زیب خاں علیگ (سرحد کے وزیر اعلیٰ) کو یہ الفاظ تحریر کیے۔

"آخر میں مجھے ایک شکایت ہے کہ لیگ کی ہائی کمانڈ کے ایک رکن اور لیگی وزارت کے ایک وزیر اعلیٰ کا خط ایک اردو کے خادم کی طرف انگریزی میں آنا اردو زبان کی ایسی توہین ہے جس کا دعویٰ آپ ہی کے اجلاس میں ہونا چاہیے۔"

مجھے یقین ہے یہ حیات بخش اور ایمان افروز تحریریں جب قارئین کے سامنے آئیں گی تو نواب صاحب کی عظیم شخصیت ان کے ذہن میں ابھر آئے گی اور اسلامی اقدار کے احیاء کا عزم اور ولولہ ان کے دلوں میں جاگزیں ہو جائے گا۔ ان تحریروں میں مرحوم کے اوصاف کی جھلک دیکھ کر یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک مردِ مومن اور قائدِ ملت تھے جن کے جملہ محاسن بیان کرنے کا حق یہ ناچیز راقم کیسے ادا کرتا جب کہ

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار

محمد عمر مہاجر

ایک شخصیت۔ ایک مطالعہ

یہ بہادر خاں مرحوم کی یاد میں عقیدت کے چند آنسو ہیں۔

بہادر خاں میرے دوست نہیں تھے لیکن میں نے ان کے لاکھوں عقیدت گذاروں کی طرح ان کو دور سے اور قریب سے دونوں طرح سے دیکھا ہے۔ دور سے دیکھنے والے ان کو عظیم انسان سمجھتے تھے۔ قریب سے دیکھنے والے ان کو عظیم تر جانتے تھے۔ یہ بڑائی ہر شخص کو نہیں ملتی۔ یہ صرف اسی کا حصہ ہوتی ہے جو محبوب خلق ہوتا ہے اور اسی وسیلے سے خدا کا محبوب بھی ہوتا ہے۔

میں حیدرآباد کے ایک کالج کے تقریری مقابلے میں اپنے کالج کی نمائندگی کر رہا تھا۔ دوران تقریر میں نے سامنے کی صف میں ایک باوقار وجیہہ اور شاندار شخص کو دیکھا مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی مسکراتی آنکھیں اور اس کا دل نواز انداز مجھے تقریر کی داد دے رہا ہے۔ مقرر اور سامع میں یہ ربط پنہاں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ مگر جب ایک بار یہ ربط قائم ہو جاتا ہے تو جنم جنم کے فاصلے اور بیگانگی سب مٹ جاتے ہیں تقریر ختم ہونے کے بعد جب میں اپنی نشست پر واپس ہوا تو وہ نگاہیں پھر ایک مرتبہ مجھے داد دیتی محسوس ہوئیں۔ میرے برابر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے مجھے بتایا کہ "یہ نواب بہادر خاں ہیں جو ابھی بلاد اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آئے ہیں۔

میں دیر تک انھیں دیکھتا رہا۔ اس لیے نہیں کہ خواجہ حسن نظامی اور دوسرے مشاہیر کی رائیں میں نے پڑھی تھیں بلکہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسے انسان کو دیکھا تھا جس نے براہ راست رسمی تعارف کے بغیر بھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ روح اس سے برسوں سے آشنا ہے جلسہ کے اختتام پر سب لوگ ان سے مصافحہ کرنے لگے۔ میں بھی بڑھا مگر مصافحہ نہ ہو سکا بہادر خاں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے گھر پر ملوں۔

اس واقعہ کے چند دن بعد شہر حیدرآباد میں میلاد النبیؐ کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں نظام دکن نے بھی شرکت کی۔ میں جلسہ گاہ کے پاس سے سائیکل سے گذر رہا تھا کہ یہ الفاظ مجھے سنائی دیے۔

"اے محمدؐ عربی کے تابخوش غلام سن! مجھ سے سن کہ آئین جہاں بانی کیا ہے۔"

یہ آواز اور یہ لہجہ اور یہ خطابت میرے لیے تو بالکل نئی تھی۔ سائیکل سے اتر پڑا جلسے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ خطیب نواب بہادر یار خاں تھے (جنھیں اسی جلسہ کے بعد بہادر یار جنگ کا خطاب ملا) یہیں میری دوسری بار ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مجھ سے کہنے لگے۔

"آپ میرے گھر تشریف نہیں لائے۔"

اور تاکید کی کہ دوسرے دن تین بجے ان سے گھر پر ملوں۔ دوسرے دن بیت الامت پہنچا (جو ان دنوں مہدی منزل کہلاتا تھا) اور بہت سے ملاقات کے آرزومند کمرۂ ملاقات میں بیٹھے تھے۔ میں نے بھی اپنا کارڈ بھیج دیا۔ کوئی

دس منٹ انتظار کیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

ہمارے محلہ میں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ میری اکثر شامیں اجاؔ کے ساتھ وہیں گزرتی تھیں۔ اس واقعہ کے کوئی تین چار دن بعد شام کے وقت اسی چائے خانے میں ہم سب جمع تھے۔ علی اختر مرحوم اور جوش ملیح آبادی کی شاعری زیر بحث تھی ایک صاحب جھوم جھوم کر جوش صاحب کے رندانہ اشعار پڑھ رہے تھے اور دوسرے صاحب کہہ رہے تھے کہ:

"رندی اور سرمستی کی ان ہی روایات نے ہماری شاعری کو ڈبو دیا ہے۔"

اچانک چائے خانے میں کچھ ہل چل سی محسوس ہوئی چائے خانے کے مالک خوشی سے ہانپتے ہوئے یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے۔ "یہاں بیٹھے ہیں"۔ ہماری نظر ادھر اٹھی ان کے ساتھ بہادر خاں کھڑے تھے۔ وہی متبسم چہرہ، وہی دلنواز نظریں لیکن اس دفعہ نظروں میں معذرت کی ایک جھلک بھی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"آپ آئے اور چلے گئے میں اس وقت حمام میں تھا۔ اب اس کی تلافی کے لیے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

میری اور ان کی نسبت آفتاب اور ذرّے کی بھی نہیں تھی۔ میں اس خلوص اور وسعت قلب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ میری اور بہادر خاں مرحوم کی ملاقات کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ میری طرح سینکڑوں عقیدت کیش ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ہر شخص اپنی جگہ یہی سمجھتا تھا کہ

لطف خاص صفدر میر سے لیے۔

ان ملاقاتوں میں مسلمانان حیدرآباد، مسلمانان ہند اور عالم اسلام کے ملی مسائل موضوع گفتگو رہتے تھے۔ تاریخ اسلام اور فرنگی استعماریت کے موضوعات پر بہادر خاں کی گفتگو سن کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ غور و فکر کی سینکڑوں نئی راہیں روشن ہو گئی ہیں۔ ان کا انداز فکر ملت اسلامیہ حیدرآباد کی اجتماعی فکر میں مرکوز تھا۔

بڑے آدمیوں کی صحبت اکثر آدمی کو کمتری کے احساس میں مبتلا کر دیتی ہے مگر بہادر خاں کی صحبت خود اعتمادی کی دولت بخشتی تھی۔

بہادر خاں مرحوم کی ایک خصوصیت جو ان کو قومی رہنماؤں میں ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی سیاست میں جھوٹ، دھوکہ اور فریب کا کوئی مقام نہ تھا۔ ۱۹۳۹ء میں مردم شماری کی اہمیت اور اس کے مسائل مسلم عوام کے ذہن نشین کرائے جائیں۔ قمر باغ میں ایک مباحثہ اس سلسلے میں ترتیب دیا گیا تھا کہ دونوں پہلو عوام کے سامنے آجائیں۔ موضوع بحث تھا "مردم شماری قومی مسائل کے حل کے لیے بہترین دستاویز ہے۔"

بہادر خاں مرحوم امیر تحریک تھے اور مولانا مظہر علی کامل امیر مخالف۔ اس جلسے میں مباحثہ کی ساری روایات ملحوظ رکھی گئی تھیں اور عوام کی دلچسپی کے لیے مباحثوں کی روایتی نوک جھونک کو بھی روا رکھا گیا تھا۔ بہادر خاں مرحوم کی بے مثل خطابت اور معترضین کو ان کے برجستہ جوابات سے مباحثے میں قہقہوں کا شور بلند ہوتا جاتا تھا۔ اسی دوران میں ایک مقرر نے مجلس اتحاد المسلمین کی اس ہدایت کی کہ "تعداد صحیح لکھائی جائے اور بڑھا چڑھا کر نہ لکھائی جائے۔" منطقی

تاویل یہ کی کہ اس ہدایت کا اصل منشا یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تعداد کا صحیح تناسب جو ہے وہ برقرار رہے۔ اس لیے اگر غیر مسلم اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھوا رہے ہیں تو مسلمانوں کو بھی بہر حال اس تناسب کو قائم رکھنا ہی پڑے گا۔"

لطیفہ آرائیوں، نوک جھونک اور شوخیوں کی اس فضا میں یکایک یہ آواز بلند ہوی۔

"مجلس اتحاد المسلمین کی ہدایت کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ اغیار جھوٹے پروپیگنڈے کے استعمال کر کے اپنی تعداد بڑھانا چاہتے ہیں اس طرح اپنے تناسب میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کا اپنا فعل ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے میری سیاست میں جھوٹ اور مصلحت کوشیوں کا کوئی مقام نہیں مجھے منظور ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بیس فی صدی سے گھٹ کر ایک فی صد رہ جائے لیکن یہ گوارا نہیں کہ جھوٹ اور دھوکے سے صحیح تناسب قائم رکھا جائے۔"

یہ آواز قائد ملت بہادر خاں کی تھی۔ اس میں کوئی شوخی یا طنز نہیں تھا۔ بے باک صداقت اور مومن کا جوش جو تعداد اور کثرت کے پیمانوں کا پابند نہیں ہوتا۔

حیدرآباد میں دستوری اصلاحات کا نفاذ ہو رہا تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین کا سیاسی مسلک یہ تھا کہ ایسی کوئی اصلاحات جن سے مسلمانوں کی معاشرتی اور خصوصی سیاسی حیثیت متاثر ہوتی ہو قابل قبول نہ ہوگی آج کے جمہوری دور میں شاید یہ بات عجیب معلوم ہو مگر اس وقت کے

حالات کا یہی تقاضا تھا اور مسلمان اپنے اس مطالبہ میں بالکل حق بجانب تھے۔ غالباً کچھ ایسی ہی اساس تھی جس کی بناء پر قائداعظم نے اعلان کیا تھا کہ دس کروڑ کی ایک قوم کو اقلیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حیدرآباد کی حکومت کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ مسلمانوں کا تعاون حاصل کیے بغیر حیدرآباد میں اصلاحات کا نفاذ ناممکن ہے چنانچہ اس بناء پر نظام دکن نے مسلمانوں کی خصوصی سیاسی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے اتحاد المسلمین کے قائد کو یہ خفیہ تیقن دیا کہ صرف خاص کے ان کے اپنے نامزد کردہ سماعدے لازماً مسلمان ہوا کریں گے۔ اور اس طرح مقننہ میں مسلم اور غیر مسلم نشستوں کا تناسب ۱۵ اور ۹۴ رہے گا۔ یہ تیقن مجلس اتحاد المسلمین کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ بہادر خاں مرحوم کے لیے بہت آسان تھا کہ اس تیقن کو صرف اپنی حد تک رکھتے اور اس کا اعلان نہ کرتے کیونکہ اصل مقصد تو بہر حال حاصل ہو ہی چکا تھا لیکن صداقت کا اخفا ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ اس لیے انھوں نے اعلان کیا کہ مجلس اتحاد المسلمین چند تیقنات کے ساتھ دستوری اصلاحات کو قبول کر رہی ہے۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک بہادر خاں مرحوم کی فراست اور صداقت پسندی کی بے شمار مثالیں میرے سامنے آئیں، اور ان کی عظمت کا نقش میرے دل میں گہرا ہوتا ہو گیا۔ ۱۹۴۱ء میں میں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور میرا ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔

۲۵ جون ۱۹۴۴ء کی رات کو میں حیدرآباد کے مضافات کے دورے پر تھا اور دریائے ماجرا کے کنارے ایک خیمے میں قیام پذیر تھا۔ ان دنوں

میری والدہ مرحومہ بیمار اور عثمانیہ اسپتال میں زیرِ علاج تھیں میں نے اسی دن چھٹی کی درخواست بھیجی تھی اور چاہتا تھا کہ جتنی ممکن ہو سکے حیدرآباد پہنچ کر اپنی والدہ مرحومہ کی تیمارداری اور خدمت میں حصہ لوں۔ رات بھر انھیں کی بیماری کا خیال رہا اور میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ خیمے کے باہر مجھے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے خوابیدہ آواز میں پوچھا کون ہے۔ کسی نے کہا حیدرآباد سے تار آیا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے سوچا وہی تار ہوگا جس کا مجھے انتظار تھا اور جس سے میں ڈر رہا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تار کھولا۔ اس میں لکھا تھا "بہادر خاں رخصت ہو گئے"۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے ان لفظوں کا کوئی مطلب نہیں ہے، جیسے یہ لفظ بے معنی ہیں۔ باجرا ندی سکون سے بہہ رہی تھی ندی کے اس پار کچھ کچے مکان دھندلے دھبّوں کی طرح نظر آ رہے تھے دو ایک چراغ کہیں ٹمٹما رہے تھے اور صبح کی پہلی کرن اندھیروں کا جگر چیرنے کے لیے مچل رہی تھی۔ اس پس منظر میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ گویا یہ تار ایک طنز ہے۔ ابھی صبح طلوع نہیں ہوئی ہے، ابھی اندھیرے باقی ہیں۔ بہادر خاں نے جس روشنی کی بشارت دی تھی وہ روشنی ابھی اندھیروں میں کھوئی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ غلط ہے کہ بہادر خاں رخصت ہو گئے۔ وہ ہمیشہ کے سچے تھے۔ اس لیے ان کا یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک اسی طرح کھویا ہوا رہا اچانک بستی کی مسجد سے اذان کی آواز آئی اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ۔ اور میری آنکھوں

میں آنسو اُمنڈ آئے۔ تار کی تحریر دھندلی ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ کاش اس تار میں یہ لکھا ہوتا کہ "تمھاری والدہ رخصت ہو گئیں۔"

جناب مختار مسعود

عطا اور سزا

محمد بہادر خاں کو بہادر یار جنگ کا خطاب جس فرمانِ شاہی کی رو سے ملا وہ رات کے ایک بجے جاری ہوا تھا۔ اس کے چند سال بعد جب بہادر یار جنگ کی شہرت کا سورج اوج پر تھا تو انھیں ایک روز نظامِ دکن کی طرف سے دو فرمان ملے جن کے عنوان عطا اور سزا تھے۔ بہادر یار جنگ نے طبیعت مشکل پسند اور حق پسند پائی تھی اس لیے سزا والے فرمان کی رسید لکھ دی۔ خطاب واپس ہوا اور جاگیر ضبط ہوئی فقر میں اضافہ ہوا، عزت اور توقیر بڑھ گئی، ثواب اور درجات کا حال دینے والے کو معلوم ہوگا خطاب کی واپسی میں بہادر یار جنگ کو خسارے کی بجائے سراسر نفع ہوا کیونکہ اس طرح ان کا اصلی نام انھیں واپس مل گیا جس میں حضور اکرم کا نام بھی شامل ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سزا کا فرمان بھیجنے والے کو وہ ادا کیوں بھول گئی جس سے خوش ہو کر اس نے خطاب عطا کیا تھا۔ وکٹوریہ پلے گراؤنڈ حیدر آباد دکن میں سیرت النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم

کا جلسہ ہو رہا تھا، نظام اچانک آ پہنچے، رعایا نے حکمران کو جلسے میں آتے دیکھا تو فرطِ حیرت سے ہل چل مچ گئی مگر مقرر تھا کہ بار بار پکارتا تھا، اے محمد عربی کے تخت نشین و تاج پوش غلام آئیں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشاہِ کونین کی نظر میں اندازِ ملوکیت کیا تھے۔

"وہ جس نے دُنیاوی قوتوں سے بے باکی اور دنیاوی خواہشوں سے لاتعلقی کا مظاہرہ برسرِ عام کیا۔ اپنا شباب ذکرِ حبیبؐ کے لیے وقف کر چکا تھا، اسے عطا و سزا کے فرمان ملنے پر رحمۃ اللعالمینؐ کا یہ جواب ضرور یاد آیا ہوگا۔ "اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا کر رکھ دیں اور چاند کو بائیں تب بھی اپنے کام سے نہ ہٹوں گا اور خدا کے کلام میں سے ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا، اس کام میں خواہ میری جان جاتی رہے۔"

محمد بہادر خاں کی ساری زندگی صرف ایک محور کے گرد گھومتی رہی جسے عشقِ رسولؐ کہتے ہیں ان کی زندگی سن و سال کے حساب سے قلیل تھی مگر اسے فکر کے لحاظ سے وقیع اور عمل کے لحاظ سے طویل کہہ سکتے ہیں۔ بہادر یار جنگ کی نصابی تعلیم بہت جلد ختم ہو گئی مگر وہ عمر بھر تفسیرِ قرآن، سیرتِ نبویؐ اور کلامِ اقبال کے طالب علم رہے، ان موضوعات پر ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور قدرت کی دریا دلی سے انھیں زبان و بیان کی طاقت بھی ان کے علم کی وسعت کے حساب سے عطا ہوئی تھی۔ محمد بہادر خاں نے ایک عمر حضورؐ کی حیات اور سیرت کے مطالعہ اور اس پر غور و فکر میں صرف کی جو وقت

وہ ذکرِ میلاد اور سنت کی پیروی میں بسر ہو گیا۔ حضورؐ کی سیرت نے انھیں سیاسی بصیرت اور حضورؐ کے ذکر نے انھیں اعجاز بیان عطا کیا۔

بہادر یار جنگ کی سیاسی بصیرت کا یہ حال تھا کہ جس رائے کا برملا اظہار کیا وہ صحیح نکلی اور جس خطرے کی طرف الاطلان نشان دہی کی وہ درست ثابت ہوا۔ اور ۱۹۳۰ء میں تل ابیب کی نئی بستی کو دیکھا تھا خواجہ حسن نظامی سے کہا کہ یہودیوں کو اب فلسطین سے نکالنا اتنا آسان نہیں رہا جتنا عربوں نے سمجھ رکھا ہے۔ سقوطِ حیدر آباد سے دس برس پہلے اعلان کیا کہ دو سو برس کے حاکم ازلی و ابدی غلام بن جائیں گے۔ علامہ مشرقی کو قریب سے دیکھا تو انھیں لکھا کہ خاکسار تحریک کے بنیادی اصولوں سے کامل اتفاق کے باوجود مجھے آپ کی قیادت پر قطعی اعتماد نہیں رہا۔ قائداعظم سے ملے تو دعا مانگی کہ اے اللہ تو میری عمر گھٹا کر اس کو عمر طویل عطا کر مسلم لیگ کے لیے بہت کام کیا مگر اس کے بیشتر عہدہ داروں کے بارے میں ہمیشہ یہ رائے رکھی کہ وہ اس ملت نامسلمان کے قائل ہیں جسے دعویٰ اسلام ہو۔ قائداعظم کے سامنے ایک بار یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان کو حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو پاکستان بنانا مشکل ہوگا۔

بہادر یار جنگ کی زبان کی گرہ ذکرِ حبیب نے کھولی۔ وہ نام ہر وقت ان کی زبان پر رہتا تھا جس کو ادا کرنے کے لیے شاعر نے منہ کو ہزار بار مشک و گلاب سے غسل دیا بھی ناکافی سمجھا ہے اس کے ورد کی برکت ان کے حصہ میں آئی اور اس کا اظہار ان کی تقریروں میں ہونے لگا میں نے بہادر یار جنگ کی پہلی تقریر اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے سیرت کے

جلسے میں سُنی۔ میرے لیے وہ بالکل اجنبی تھے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ سیرت کا ہفتہ منایا جا رہا تھا اور جہاں دور دور سے شرکت کے لیے بلائے گئے تھے: نامور عالم مشہور شیر نگار، معروف مفسر اور دینی اداروں کے معلم سبھی اپنی مخصوص سادگی اور وضع قطع کے ساتھ موجود تھے۔ حفیظ جالندھری بھی آئے تھے اور عمر کے اس دور سے گذر رہے تھے جب شاہنامہ اسلام سناتے ہوئے نہ وہ تھکتے تھے اور نہ اللہ کے سننے والے۔ ایسے عالمانہ، شاعرانہ اور غریبانہ ماحول میں دولت آصفیہ کے ایک یار جنگ کو تقریر کی دعوت دینا میری سمجھ سے باہر تھا۔ بہت سوچا تو یہ خیال گذرا کہ شاید منتظمین کو اس نواب سے چندہ ملنے کی توقع ہے جو ترکی ٹوپی، کسی ہوئی شیروانی اور تنگ پاجامہ پہنے تنگنائے دکن سے چل مسلم یونیورسٹی میں آ نکلا ہے۔ وہ خطاب یافتہ جاگیردار تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو پہلے اپنے دونوں انگوٹھے اچکن کی سامنے والی جیبوں میں اٹکائے۔ تقریر ہوئی تو اہل درد کو اس جاگیردار نے لوٹ لیا۔ کیا وہ جلسہ کیا وہ دن یہ تقریر تو سیرت کے پورے ہفتہ کی تقریبات کا حاصل بن گئی۔ اس کے بعد اگلے چند سال لوگ اس ہفتہ اور اس مقرر کی آمد کا انتظار کرتے رہتے۔ اس روز تقریر ختم ہوئی تو میں نے اپنی اچکن کی جیب سے آٹوگراف البم نکال کر بہادر یار جنگ کے سامنے رکھ دی۔ بہادر یار جنگ نے البم کو ترچھا کیا اور صفحے کے وسط کے بجائے اس کے نصف حصے کے درمیان بڑی تیزی سے محمد بہادر خاں لکھا۔ اس کے نیچے چھوٹی سی لکیر لگائی، پھر ۳۰ اگست ۱۹۳۹ء لکھا، اور اس کے نیچے ایک بڑی سی لکیر لگا کر البم مجھے واپس کر دی۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۴ برس کی

تھی اور برصغیر کی تاریخ میں اپنا مستقل مقام حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس صرف پانچ برس باقی رہ گئے تھے۔ دکن میں وہ بہت سے کام شروع ہو چکے تھے۔ فجر کے وقت تفسیر، جمعرات کو درس اقبال، گاہے گاہے میلاد کی محفل اور تبلیغ کے جلسے، شب و روز اتحاد المسلمین کی تنظیم کا کام، اب وہ برصغیر کے گوشے گوشے میں خاکسار تحریک، پاکستان تحریک، آل انڈیا مسلم لیگ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے ذریعہ اسلام کا پیغام عام کرنے لگے۔ شاید انھیں احساس تھا کہ کام بہت پڑا ہے اور مہلت بہت کم اس لیے وہ ہر کام بہت تیزی اور تندہی سے کیا کرتے تھے۔ تیزی سے لکھا ہوا خط خوشخطی کے زمرے میں نہیں آتا مگر خلوص اور تندہی سے کیے ہوئے کام کارنامے بن جاتے ہیں۔

بہادر یار جنگ کا قد لانبا اور بدن دُہرا تھا۔ وہ خدوخال سے معمّر فربہی سے معتبر اور ملبوس سے معزز نظر آتے تھے۔ ایک روز خاکسار تحریک کے رکن کی حیثیت سے انھیں پریڈ گراؤنڈ کے چکر لگانے کی سزا ملی۔ وہ حکم سنتے ہی بلا چون و چرا میدان میں دوڑنے لگے نہ حیثیت کا خیال نہ ہیئت کا خیال جس نے بھی نظم و ضبط کا یہ مظاہرہ دیکھا وہ دنگ رہ گیا۔ سزا دینے والے بھی تعمیل کے اس انداز سے متاثر ہوئے اور باقی سزا منسوخ ہو گئی۔ لوگ انھیں مقرر کی حیثیت سے جانتے تھے اور عام خیال یہ تھا کہ مقرر محنت اور عمل کی جو تلقین اپنی تقریروں میں کرتے ہیں وہ خود اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ڈیسا سیتھنز نے شجاعت کے بارے میں اتنی شاندار تقریریں کیں کہ ہزاروں آدمی انھیں سن کر میدانِ جنگ میں جان پر کھیل گئے مگر جب وہ خود میدانِ جنگ میں پہنچا تو موقع ملتے ہی فرار ہو گیا۔ یہ فرار ہمیں ہر ناصح، محتسب اور مصلح کی زندگی میں ملتا ہے

لوگ حیران ہوئے کہ بہادر یار جنگ گفتار ہی نہیں کردار کا بھی غازی ہے
اپنے بیگانے سبھی دکھ دینے کو تیار ہیں اور یہ اصول کی خاطر امتحان کا خندہ
پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ نظام سزا دے تو قبول، علامہ مشرقی سزا دیں تو
قبول، مہاراجہ کشمیر گرفتار کرنا چاہے تو یہ حاضر، بہادر یار جنگ جب باعمل عالم
کی صورت میں سامنے آئے تو لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے ان میں ایک گورنمنٹ
درباری بھی شامل تھے جنھوں نے ۱۹۴۲ء میں ایک قصیدہ لکھ مارا۔ بہادر
یار جنگ نے قصیدہ گو سے شکایت کی کہ آپ نے تعریف سے مطلع کر کے غرور کو
ہوا دی اور خواہ مخواہ اپنا وقت اور پیسہ ضائع کیا۔ یہ نصیحت چنداں کارگر نہ
ہوئی کیونکہ وہ قصیدہ گو اس واقعہ کے بیس پچیس برس بعد بھی ہر کہ و مہ کو قصیدہ
بھیجتے رہتے ہیں۔ میں ایک ایسے عہدہ پر بھی رہا ہوں جہاں یہ ہر سال ایک قصیدہ
پیش کرتے اور دو سو روپے انعام پاتے تھے۔ میری باری آئی تو میں نہ بہادر
یار جنگ کی جرأت دکھا سکا اور نہ پیش روی دریا دلی میں نے انھیں مایوس
کرنے کے لیے فائل پر لکھا کہ اس کام کے لیے صرف سو روپے دیئے جا سکتے ہیں۔ خیال
تھا وہ انکار کر دیں گے اور یہ سلسلہ بند ہو جائے گا۔ مگر انھوں نے یہ عطیہ قبول
کیا اور رسید کے طور پر پھر ایک قصیدہ کہہ ڈالا۔ مجھے ان کی ثابت قدمی سے
زیادہ حیرت برٹش راج کی پیش بینی پر ہوئی جس نے اس ہونہار پروا کے
کو اوائل جوانی میں ہی شناخت کر لیا اور گورنمنٹ درباری اور کرسی نشین
کے اعزازات عطا کیے۔

بہادر یار جنگ کو جب ایک بار عہدے کی پیش کش ہوئی تو کہا کہ "مجھے
کرسی وزارت پر بیٹھ کر امور مملکت پر غور کرنے کے لیے نہیں بلکہ گرد کوچہ و بازار

بن کر قلوب کی دُنیا میں طوفان برپا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔" بہادر یار جنگ نے یہ طوفان اپنی تقریروں سے اٹھایا تھا اور اتنے سال گزرنے کے باوجود اس طوفان کی ایک لہر آج بھی میرے دل میں موجزن ہے۔ میں نے انھیں کئی بار سنا تھا۔ ان کی تقریر کبھی آتش فشاں ہوتی اور کبھی آبشار بعض تقریروں میں یہ دونوں صورتیں جمع ہو جاتیں۔ وہ تقریریں جن میں عظیم کی آزادی اور پاکستان کا مطالبہ ہوتا یا فکر و عمل یا سرفروشی و جانبازی کی تلقین ہوتی بالکل آتش فشاں کے مانند ہوتیں، آگ اور حرارت کا سیل بے پناہ جو ہر مقابل پر حاوی ہو جائے اور ہر رکاوٹ پر غالب آجائے۔ جو تقریریں اسوۂ رسول، مسلمانوں کی نامسلمانی، ایمان کی کمزوری اتحاد کی کمی، فکر صحیح سے محرومی اور راہِ حق سے انحراف کے بارے میں ہوتیں وہ ایسے آبشار کی طرح تھیں جو یہ کہتے ہوئے نیچے گر رہا ہو کہ اچھا تم میری سطح تک بلند نہیں ہوتے تو لو میں بلندیوں سے اتر کر تمھاری کشت ویراں کو سیراب کرتا ہوں۔

عام طور پر خطابتی تقریریں احاطہ تحریر میں آتی جاتی ہیں تو وہ بہت معمولی لگتی ہیں۔ کسی واقعے یا حادثے کی نسبت سے کی ہوئی دھواں دھار تقریر پر جب کچھ وقت بیت جائے اور اسے پڑھنے والا ذہنی طور پر اس لمحے سے بہت دور ہو جائے جو سامعین کو میسر تھا تو ایسی تقریر بجھی ہوئی آگ کے دھوئیں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یوں بھی مقرر کی ذات، صفات، انداز اور آہنگ سے تقریر میں تاثر پیدا ہوتا ہے اور تحریر میں ان کی غیر موجودگی سے جو کمی واقع ہوتی ہے وہ وقت کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں

تک کہ ایک مدت گذرنے کے بعد تقریر پڑھنے کی چیز ہی نہیں رہتی جو تقریر اس اصول سے مستثنیٰ ہوا سے کلاسیک میں جگہ مل جاتی ہے۔ ایک دوست نے جو یہ رائے سنی تو پوچھنے لگے کہ یہ جو ہم تم بہادر یار جنگ کے جلسوں میں پروانہ وار جاتے اور ان کی تقریروں پر دیوانہ وار سر دھنتے وہ کہاں تک جائز تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ایک لمحہ کے جادو اور ایک یادداشت کے فریب میں آکر یہ کہہ دیتے ہیں کہ بہادر یار جنگ سا مقرر دیکھا نہ سنا میرے یہ دوست عمر کے اس حصے اور عہد کے اس درجہ پر ہیں جہاں سوچ کی نہج بدل جاتی ہے اور سارا ماضی مشتبہ اور مشکوک نظر آتا ہے میں نے ان سے وعدہ کیا کہ بہادر یار جنگ کی ایک مشہور تقریر کا تجزیہ کروں گا تاکہ ان کی تسلی ہو جائے۔

بہادر یار جنگ نے اپنے خطوں کی نقلیں محفوظ رکھیں مگر ان کی تقریروں کا کوئی مجموعہ نہیں ملتا، ان کی صرف دو چار تقریریں محفوظ ہیں وہ تقریر بھی شامل ہے جو ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس میں کراچی میں کی گئی تھی۔ یہ شبہ ان کی نہایت کامیاب سیاسی تقریر ہے۔ میں نے اسی تقریر کا تجزیہ اپنے دوست کو پیش کیا تاکہ وہ اپنے ماضی سے اتفاق رائے کر لیں۔ بہادر یار جنگ کی یہ تقریر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے آخری روز کی تھی۔ یہ اس اجلاس کی آخری تقریر ہوگی۔ اس کے بعد سال بھر تک ایسا موقع نہ آئے گا، اور کسے خبر تھی کہ اس وقت یہ مقرر موجود نہ ہوگا۔ تقریر کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دم کو غنیمت جان کر بول رہے ہیں، اور ذرا دیر میں برخاست ہونے والے اجلاس کے سامعین سے دل کھول کر ایسی باتیں کرنا چاہتے ہیں جن کا تاثر اگلے اجلاس تک ہی نہیں بلکہ مستقل اور مسلسل ہو۔ زمانے کے اعتبار سے

یہ تقریر قرارداد پاکستان کی منظوری کے چار برس بعد کی جا رہی تھی۔ تحریک پاکستان مقبول ہو چکی تھی۔ محمد علی جناح اب قائداعظم کہلاتے تھے تحریک جوان تھی اور قائداعظم جوان ہمت مگر رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا تھا کہ عمر کے لحاظ سے قائداعظم ضعیف ہیں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو تحریک کو ضعف آجائے گا۔ کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ مسائل ہند کے آخری سیاسی فیصلے کے وقت اس قرارداد سے محض پاسنگ کا کام لیا جائے گا۔ کبھی یہ شبہ بھی ہونے لگتا کہ اتنی بڑی تحریک کامیابی کے لیے ایک طویل جدوجہد درکار ہوگی اور اتنا عرصہ لوگوں کے دلوں کو اسی طرح گرمائے رکھنا کیونکر ممکن ہوگا۔ بہادر یار جنگ کی تقریر میں بے یقینی کے بجائے ایک غیر متزلزل یقین ملتا ہے اور وہ سامعین کے جذبات کو سدا اس درجہ حرارت پر دیکھنا چاہتے ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ ان کی تقریر کا خلاصہ ایک جملہ میں یوں کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان برحق ہے اور آج نہیں تو کل بن جائے گا، اس کے حصول کے لیے لفظ عمل اور اس کے قیام اور بقا کے لیے انقلاب محمدی کی ضرورت ہے۔ تقریر کے دو حصے اور ہر حصے کے تین ذیلی حصے ہیں مگر ان کے عنوانات قائم کیے جائیں تو کچھ یوں ہوں گے۔ پہلا حصہ حصول پاکستان دوسرا حصہ قیام پاکستان، پہلے حصے کے ذیلی عنوانات صبح امید، روز عمل اور شب کشمکش ہوں گے اور دوسرے حصے کے دستور، نظام تعلیم اور نظام معاش۔ ختم کلام کا عنوان اتباع سنت ہو سکتا ہے خرد اور جنون کا جو امتزاج اس تقریر میں ملتا ہے اس کی مثال اردو ادب میں جو چند تقریریں محفوظ ہیں ان میں نہیں ملتی۔

یہ تقریر دھیمے انداز سے شروع اور اسی انداز سے ختم ہوتی ہے پہلا

انداز طنزیہ اور ناصحانہ ہے اور اس کے لیے غالب کا شعر منتخب کیا ہے۔ آخری وار طنزیہ اور حکیمانہ ہے جس کے لیے اقبال کا سہارا لیا ہے۔ غالب اور اقبال کے درمیان جو مسافت ہے اس میں تین مرتبہ جوش بڑھتا ہوا ایک نقطۂ عروج پر جا پہنچتا ہے مگر چوتھی بار نقطۂ عروج اچانک آہستگی سے آجاتا ہے اور تقریر وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ وہ نقطہ ہائے عروج پاکستان سے متعلق ہیں اور وہ کلی حمیت کے بارے میں ایک بار دو قومی نظریے کی حمایت کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ اگر پاکستان بہ التجا نہیں مل رہا تو ہم بہ زور حاصل کریں گے اور پھر تقریر کے دوسرے حصے میں مسلم لیگ پلاننگ کمیٹی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسی تجاویز مرتب کرے جو پاکستان میں اسلامی دستور حیات، اسلامی نظام تعلیم اور اسلامی معاشی نظام کے رائج کرنے میں مددگار ہوں۔ اس موقع پر قائداعظم کو اس طور پر مخاطب کیا جس کی جرأت قائداعظم کی زندگی میں کسی اور کو نہ ہو سکی۔ کہنے لگے کہ "قائداعظم میں نے پاکستان کو اسی طرح سمجھا ہے اور اگر آپ کا پاکستان یہ نہیں ہے تو ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے۔"

مقرر کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف پاکستان بزور حاصل کرنے کا عزم ہے اور دوسری طرف پاکستان ملے تو لینے سے انکاری ہیں۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں میں زور بیان انتہا پر ہے، لوگ پہلی صورت میں بھی اتنے ہی پرجوش ہو جاتے ہیں جتنا دوسری صورت میں۔ ایک مختصر تقریر میں سامعین کے جذبات کو یوں قطبین تک لے جانا اور واپس لے آنا مقرر کے فن کا کمال ہے۔

اس تقریر کا سب سے موثر حصہ وہ اعلان ہے جو مسلم لیگ کی کونسل

آف ایکشن کو اپنی خدمات پیش کرنے کے متعلق ہے۔ تقریر کا ایک حامیانہ انداز یہ ہے کہ مقرر اپنے مقصد کے حصول کے لیے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کی تلقین یا وعدہ کرتا ہے۔ چند نعرے اس موقع پر سامعین کی طرف سے بھی لگ جاتے ہیں اور بات رفت و گذشت ہو جاتی ہے۔ بہادر یار جنگ پہلے ہی مال و جاہ کی قربانی دے چکے تھے، اور زبان بندی کی پابندی سہہ چکے تھے۔ ہر شخص ان کی قربانیوں کا قائل تھا مگر وہ خود انھیں ناکافی سمجھتے تھے اس لیے ہزاروں گواہ بنا کر اجلاس میں ایک نیا عہد کرتے ہیں اس کے گواہوں میں قائد اعظم، سامعین، سورج، ہوا اور کروبیان کو شامل کیا مگر اس پر اکتفا نہ کی اور خدائے قادر کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ ملت محمدی کے راستے میں جس دن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی اور جسم زخموں سے چور ہو گا وہ ان کے لیے عید کا دن ہو گا۔

سامعین گرما گئے، زندہ باد کے نعرے لگے، سبحان اللہ اور مرحبا کی آوازیں آئیں، پھر سب نے بیک آواز کہا کہ وہ بھی اس راہ میں مقرر کے ساتھ قربان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ ایک ایسی تقریر جس پر مقرر غور و فکر کر چکا تھا اور سامعین اس کے ایک نقطۂ عروج پر پہنچ کر مقرر کو اپنی خدمات پیش کر رہے تھے یکایک مقرر اور سامعین کے ایک فی البدیہہ مکالمہ سے تاثر اور کامیابی کی انتہائی منزل پر جا پہنچی۔ تقریر کے اس حصے کا اقتباس اگرچہ قدرے طویل ہے مگر بہادر یار جنگ کی ذات اور ان کے فن خطابت کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی اقتباس نہیں ہو سکتا۔ جوں ہی مجمع سے آوازیں کہ "ہم بھی آپ کے ساتھ قربانی دینے میں دوش بدوش ہوں گے۔"

بہادر یار جنگ نے کہا "اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے۔ میں نے اپنے جس عزم کا آج اظہار کیا ہے وہ میرے بارہ سال کی شبانہ روز فکر و تعمق کا نتیجہ ہے میں نے اس کی تیاری اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا، جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو، اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا تصور کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو، مسلمانو! جو تصفیے جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں بسا اوقات آنی اور اس لیے فانی ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے جو شجر ملت میں پھول بن کر چمکنا چاہتے ہوں اور پھول بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں، ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہِ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو کر مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔"

میرے دوست نے جب یہ سنا تو کہنے لگے کہ شخص غضب کا نکلا، ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان گفتار میں فرد اور کردار میں مرد۔ طالب علمی کے زمانے میں ہم نے انھیں جو کچھ سمجھا تھا وہ ان کے مرتبہ سے کم تھا اور ان کی منزل کو نہ پہچان سکے، بہادر یار جنگ نے جامعہ عثمانیہ کے ایک خط میں لکھا۔" اب سنیئے میری منزل کیا ہے؟ میری منزل مسلمانوں کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاج نبوت پر دیکھنا ہے۔ میرا عمل میری مجلس کی

قراردادیں اور میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ گو ہمت عالی کے نزدیک یہ منزل بھی سنگ میل ہے اور حقیقی منزل تاج خلافت الٰہیہ کا زیب سر کرنا اور فرشتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا ہو سکتا ہے۔" میرے دوست جذبات سے مغلوب ہو گئے اور زیر لب بولے، کیا عجب کسی فرشتے نے خدا سے التجا کی ہو کہ محمد بہادر خاں کی آخری خواہش بھی پوری ہونی چاہیے۔

مظہر الدین صدیقی

بہادر یار جنگ اور حیدرآباد

اس مضمون کا عنوان "بہادر یار جنگ اور حیدرآباد" اس حقیقت کے اظہار کے لیے منتخب کیا گیا ہے کہ بہادر یار جنگ ریاست حیدرآباد کے پندرہ لاکھ مسلمانوں کی تہذیب اور جذبات بہترین اقدار کی علامت تھے۔

وہ نہ صرف مسلمانان دکن کے ثقافتی اور روحانی ماضی کے نمائندہ تھے بلکہ وہ ان کے جاگتے ہوئے شعور اور ایک بہتر مستقبل کے لیے ان کی خواہشات اور جدوجہد کی بھی علامت تھے بالفاظ دیگر وہ ایک ایسے رہنما تھے جن کے سہارے قوم حیات نو کی طرف چھلانگ لگا کر وقت کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی

بہادر یار جنگ ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جاگیردار

تاج و تخت ریاست سے گہری وابستگی رکھتا تھا۔ اس وابستگی سے اس طبقے کے اپنے مفاد بھی وابستہ تھے۔ یہ باتیں ایک آدمی کے لیے عوامی اور جمہوری لیڈر بننے میں بہت بڑی رکاوٹ بن سکتی ہیں مگر بہادر یار جنگ کے خلوص نے ان رکاوٹوں کو بے اثر بنا دیا۔ بنیادی طور پر وہ ریاست حیدرآباد کے مسلمانوں کے رہنما تھے۔ مگر ان کے خلوص اور زبردست قائدانہ صفات نے انھیں جلد ہی ایک کل ہند شخصیت بنا دیا۔ سارے مسلمان انھیں قائداعظم کا معتمد الیہ، دست راست اور مستقبل کا عظیم رہنما سمجھتے تھے۔

بہادر یار جنگ نے شہرت اور مقبولیت کی منزلیں اس سرعت سے طے کیں کہ ان کی سیاسی زندگی میں کسی ایسے دور کی نشاندہی مشکل ہے جس میں وہ آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہوں۔ قیادت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے ہی وہ ایک بے مثال مقرر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے ان کا زور بیان فصاحت، اردو زبان پر ان کا غیر معمولی عبور، قرآن مجید کی گہری بصیرت ان کی تقریروں کو غیر معمولی طور پر پُر اثر بناتے تھے سیاسی تقاریر میں بھی ان کا مرکز و محور قرآنی تعلیمات ہی ہوتا اور یہی تعلیمات وہ اپنے سامعین تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔

مگر وہ قرآنی حوالے فقہی پیچیدگیوں کے اظہار کے لیے استعمال نہ کرتے جیسا کہ بعض علماء کرتے نظر آتے ہیں۔ اور کسی فرقہ کی تائید میں قرآنی آیتیں پیش کرتے جیسا کہ اکثر واعظین کا طریقہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ قرآنی آیتوں کو کسی خاص عقیدے کی حقانیت کے ثبوت کے لیے پیش کرتے تھے بلکہ وہ لوگوں کو منظم زندگی کے رازوں سے آگاہ کرنے کے لیے قرآنی احکام سناتے تھے۔ وہ قرآنی

آیات سنا کر لوگوں کو سماجی برائیوں، باہمی منافرت، تنگ نظری، دولت کی حرص اور سماجی عزت کے غلط تصورات اور نقصانات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ قرآنی تعلیمات کے ذریعہ ملّت کو جدید نو کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے۔ وہ بتلانا چاہتے تھے کہ قرآن حکیم جادو منتر یا عمل عملیات کی کتاب نہیں ہے۔

برصغیر میں بہادر یار جنگ جیسا باکمال مقرر نظر نہ آتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں آدمی انھیں گھنٹوں مبہوت اور مسحور ہو کر سنتے۔ ان کی زبان میں بہتی دریا کی روانی ہوتی۔ اور لفظ تیز رو موجوں کی طرح رواں دواں نظر آتے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک جلسے میں بہادر یار جنگ نے ایک مقرر کا تعارف کروایا اور کہا کہ اگر وہ کسی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے جھجکتے ہیں تو وہ یہی ہستی ہیں ہم نے بڑی توجہ سے ان کی تقریر سنی۔ ان کی زبان واقعی قابلِ تعریف تھی۔ بڑی روانی سے بولتے تھے مگر وہ حرارت محسوس نہ ہوئی جو بہادر یار جنگ کو سن کر محسوس ہوتی۔ وہ آگ جو سننے والے کے دل سے نکل کر سننے والے کی روح کو گرما دیتی کبھی نظر نہ آئی۔

اسی حیدرآباد میں میں نے ایک اور مذہبی مقرر کو بھی سنا۔ ان بزرگ کو بھی فنِ خطابت میں کمال حاصل تھا۔ وہ جب چاہتے اپنے سننے والوں کو رُلا دیتے۔ لفظ ان کی زبان سے یوں ادا ہوتے کہ گویا نکال سے ڈھل کر نکل رہے ہوں۔ قرآنی آیات یوں پڑھتے کہ تقریر میں جان پڑ جاتی۔ پھر برمحل اور برجستہ اشعار کا کیا کہنا۔ مگر مجھے یہاں بھی وہ بات نظر نہ آئی جو دلوں کو تڑپا دیتی ہے۔

بہادر یار جنگ میں ضد اور ہٹ دھرمی نام کو نہ تھی مسلم دنیا کے مسائل سے اُن کی آگاہی نے ان میں بڑی معقولیت پیدا کر دی تھی۔ اقبال کا انھوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فکر اقبال کو عام کرنے کی خاطر انھوں ..... نے اپنے گھر میں درس اقبال کا اہتمام کیا تھا جس میں حیدرآباد کے بہترین دماغ شریک ہوتے تھے۔ وہ علامہ کا یہ شعر بڑے جوش سے پڑھتے تھے ؎

زمانہ ہیچ نہ داند حقیقت اورا
جنون قیاست کہ موزوں بہ قامت ست

انھوں نے روح مسلمانی کے ضعف و انحطاط کا راز سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں میں وہ عشق اور خلوص باقی نہیں رہا جس کے بغیر کوئی بڑا کارنامہ چاہے وہ سیاست کے میدان میں ہو یا مذہب اور معاشرت کے میدان میں انجام نہیں پا سکتا۔ مسلمان ایک بڑے مقصد کے لیے مرجانا جانتے ہیں اور اپنی اس صلاحیت کا ثبوت تاریخ کے مختلف ادوار میں پیش بھی کر چکے ہیں مگر سوئے ہوئے۔ زندگی کے چشموں کو پھر سے جگانے کے لیے مرجانا ہی کافی نہیں ہوتا کیونکہ مرجانا آسان ہے مگر کسی مقصد کی خاطر جینا اور مصائب برداشت کرنا مشکل ہے کیوں کہ جان کی قربانی جو قومی زندگی کے بعض اہم موقعوں پر ضروری ہو جاتی ہے ایک طویل جدوجہد اور کشمکش کا آخری باب ہوتی ہے۔ اگر جہد مسلسل، وقت، دولت اور آسائشوں کی قربانی ساتھ نہ ہو، اور ملت کا ایک بڑا طبقہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کی راہ میں ان منازل سے نہ گذرے تو صرف جان کی قربانی سے کوئی بڑا نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی جہد مسلسل اور قربانی کا نام جنون ہے جو اقبال ملت میں پیدا کرنا چاہتے ہیں

مقصد کے حصول کا جنون، مخلصانہ جد و جہد کا جنون، سود و زیاں کے اندیشوں سے بے نیاز کر دینے والا جنون اور ایسا انداز فکر و عمل جو دنیاداروں کی نظر میں پاگل پن قرار پاتا ہے۔

قرآن نے پیغمبر اسلام کے متعلق یہ کہہ کر کفارہ کی تردید کر دی کہ "وہ نہ شاعر ہیں اور نہ مجنوں"۔ یہی وہ لگن ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ یہی وہ جنون ہے جو عقل و خرد کی منزل ہے اور بہادر یار جنگ نے ایک ایسے مقصد کے لیے جو انہیں عزیز تھا اپنی جاگیر، خطاب اور اعزاز واپس کر کے اپنے اسی جنون کا عملی ثبوت پیش کیا۔

نواب صاحب مسلم معاشرے کے اسی معاشی عدم توازن سے بخوبی واقف تھے جس نے اس کی زندگی کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس کی خاطر انھوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ اسلام کے معاشی اصولوں کی روشنی میں جدید زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈا جا سکے۔ مگر بدقسمتی سے یہ کمیٹی اپنا کام مکمل نہ کر سکی۔

ایک مرتبہ میں کلام اللہ کی ایک آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے نواب صاحب کے پاس سورۂ نحل کی اکھترویں آیت جس کا ترجمہ ہے "اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں۔ سو جن کو بڑائی دی وہ نہیں پہنچا دیتے، اپنی روزی ان کو جن کے مالک ان کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب ان میں برابر ہو جائیں کیا وہ پھر اللہ کی نعمت سے انکار کریں گے۔"

نواب صاحب نے کہا کہ ان کے خیال میں اس آیت سے دولت کی مساویانہ تقسیم کا حکم نکلتا ہے۔ مگر پھر یہ کہا کہ قطعی طور پر کچھ کہنے سے پہلے وہ مختلف علماء سے گفتگو کی جن کا کہنا ہے کہ اس قسم کی مساویانہ تقسیم خدا کی

عنایات سے انکار کے مترادف ہوگی۔ میرے خیال میں علماء کا یہ استدلال صحیح ہے کیونکہ کسی معاشرے میں اس انداز کی معاشی مساوات انسانی فطرت کے مطابق نہ ہوگی۔ اس سے انفرادی کوششوں کا جذبہ فوت ہو جائے گا۔

میری نظر میں یہ واقعہ نواب صاحب کی عظمت کا ثبوت پیش کرتا ہے وہ ایک بڑے لیڈر تھے اس معاملہ میں انھوں نے اپنے قائدانہ مقام کی پرواہ نہ کی انھوں نے ایک سچے عالم کی شان کا مظاہرہ کیا جو اپنے خیال اور اپنے اخذ کردہ نتائج کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ کیونکہ جو شخص جو اپنے آپ کو ہمہ داں اور اپنے خیال کو قولِ فیصل سمجھتا ہے بڑا عالم نہیں کہلا سکتا۔ بہادر یار جنگ میں وہ فروتنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی جو سچی عظمت اور بڑائی کی شان ہے۔

بہادر یار جنگ بڑی مختصر زندگی لے کر آئے تھے۔ اپنی زندگی، شہرت وقبولیت اور قیادت کے شباب کے عالم میں وہ رخصت ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی وہ شان بھی رخصت ہو گئی جس کا نام حیدر آباد تھا۔ دنیا میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو بذاتِ خود ایک جماعت اور ملت ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بہادر یار جنگ بھی ایک ایسے ہی فرد تھے۔ ان کی وفات بھی شاید ان کے لیے مناسب ہی تھی ورنہ بھلا اس ذلت اور نکبت کے کیسے متحمل ہوتے جس کا شکار ان کے بعد ان کا حیدر آباد ہوا۔ جہاں مسلم اقتدار کا پرچم سرنگوں ہو گیا اور جہاں مسلم اقتدار کا سات سو سالہ دور ایک دن میں مٹ کر رہ گیا۔

نصر اللہ خاں

کچھ یادیں کچھ باتیں

نواب بہادر یار جنگ تقریر کرتے تھے تو یہ مصرعہ زبان پر آتا تھا ؎

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

ایسی بے بدل اور نادر شخصیتیں برسہا برس کے بعد وجود میں آتی ہیں۔ بہادر یار جنگ اس قافلے کے ہدی خواں تھے جس کی منزل پاکستان تھی ان کی گفتگو اور ان کے بیان میں سحر تھا۔ ان کی خطابت کے سحر نے سوئی ہوئی ملت کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اگر بہادر یار جنگ نہ ہوتے تو پاکستان کے حصول میں سخت مشکلات پیش آتیں۔ یوں خطیب تو ملت اسلامیہ میں اور بھی تھے لیکن بہادر یار نے فنِ خطابت کے ایک نئے مکتب کی داغ بیل ڈالی۔ یہاں آواز کا زیر و بم اشعار کا سہارا اور جذبات کے اظہار میں آواز کی رقت سے انگیخت کا روایتی کاروبار نہ تھا اور نہ الفاظ کا شکوہ تھا یہاں جذبے کا خلوص تھا۔ جو بات نکلتی دل کی گہرائی سے نکلتی اور وہ راست سننے والوں کے دلوں پر اثر کرتی تھی۔ پھر علم تھا عمل تھا، نظر تھی، شخصیت تھی، قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔ ڈاکٹر محی الدین صدیقی لکھتے ہیں:

"ملہم غیب کی عطا کردہ وہ لافانی آواز جس نے لاکھوں انسانوں

کو خوابِ غفلت سے جھنجوڑ کر بیدار کیا تھا اگرچہ اب خاموش
ہے لیکن اس کی لہریں اب بھی فضائے بسیط میں مرتعش ہیں"

ان ہی لہروں کو ہر سال ہم بہادر یار جنگ کی برسی کے موقع پر ارتعاش میں لاتے ہیں تاکہ وہ قافلہ کہ جس کے ہدی خواں بہادر یار جنگ تھے اور جو منزل پر پہنچ کر سو گیا ہے۔ پھر جاگ اٹھے۔

دکن کے قدیم فرمانرواؤں نے سلطان المجاہدین ابوالفتح ٹیپو کے ساتھ جو سلوک کیا تھا جس سے دکن کی تاریخ داغدار ہو گئی تھی اسے نواب بہادر یار جنگ نے اپنی قابلیت اپنے ایثار اور اپنی جد و جہد سے مٹا ڈالا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے سرزمین دکن نے ایک دوسرے بے تاج و تخت ٹیپو کو جنم دیا ہے جس بے شمار محاذوں پر اسلام دشمنوں سے بے تیغ و سناں جنگ کی اور سرخ رو ہوا۔ اس نے ٹیپو سلطان شہید کے خون کی آبرو رکھ لی۔ اس وقت ہمارے سامنے بہادر یار جنگ کے مکاتیب ہیں (مکاتیب بہادر یار جنگ) جس کے مولفین نواب صاحب مرحوم کے رفقاء جناب شاہ عالم خاں اور جناب وحید الدین خاں بوزرقی ہیں۔ ان مکاتیب کے مطالعے سے بہادر یار جنگ مرحوم کی شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

وائسرائے ہند دکن کے دورے پر آئے ہیں وہ شہزادہ برار نواب اعظم جاہ بہادر کے مہمان ہیں نواب صاحب نے شہزادہ اعظم جاہ کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا ہے جس کا متن یہ ہے:۔

سرکار والا تبار!

اس موقع پر جب کہ ڈیوڑھی مبارک میں ہز ایکسی لنسی وائسرائے و

گورنر جنرل ہند کی میزبانی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ موروثی وابستہ دامن دولت اجازت چاہتا ہے کہ خواجہ حافظ کے ایک شعر میں اپنے مسلک زندگی کی وضاحت اپنے آقازادے پر کرے خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

تو بندگی کن و از خواجہ التماس مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

زیادہ حد ادب۔

الٰہی آفتاب عمر و اقبال شہزادہ والا تبار زیر سایۂ عاطفت حضرت شمس الملت والدین ہمیشہ تابان و درخشندہ باد۔ فقط۔

عرض گذار خدوی جاں نثار موروثی
بہادر یار جنگ

یہ چند الفاظ ہزاروں مضامین پر بھاری ہیں۔ اگر نواب بہادر یار جنگ چاہتے تو وہ دکن سے ترک سکونت کر کے دلی یا کسی دوسرے بڑے شہر میں اٹھ آتے اور زیادہ دلجمعی سے تحریک پاکستان کے لیے کام کرتے لیکن وہ دکن کے لاکھوں مسلمانوں کو کس پر چھوڑتے اس سلسلے میں وہ قائداعظم کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"میری حالت ایک ایسے باز کی ہے جس کو بلبل کی طرح پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور جس پر فضائے بسیط ممنوع کر دی گئی ہو حیدرآباد کی تنگ زمین میرے طائر جذبات کے لیے فی الحقیقت ایک قفس سے کم نہیں ہے۔ جی میں آتی ہے کہ تیلیاں توڑ کر باہر نکل پڑوں۔ لیکن حیدرآباد کے اتنے حقوق

مجھ پر ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں کو عالم کش مکش میں چھوڑ دینا احسان فراموشی سے کم نہ ہوگا۔ اس لیے کوشش کر رہا ہوں کہ وہی کام جو آپ کی قیادت میں برا عظم ہند میں ہو رہا ہے میری ناچیز مساعی سے سرزمین دکن میں ہو۔"

نواب بہادر یار جنگ ایک محفل میلاد میں اسوۂ حسنہ پر تقریر کر رہے تھے۔ دوران تقریر جب ان کی نظر نظام الملک آصف جاہ سابع پر پڑی تو انھوں نے نظام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"محمد عربی کے اے تخت نشین و تاج پوش غلام! آ میں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشہ کونین کی نظر میں انداز ملوکیت کیا تھے؟"

اور پھر بہادر یار جنگ نے سیرۃ پاک کے اس مخصوص پہلو پر اس انداز سے اظہار خیال کیا کہ شہنشاہ دکن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جب محفل میلاد ختم ہوئی تو نواب نے آصف جاہ سابع کو درباری انداز سے سلام کیا۔ نظام نے بہادر یار جنگ کی خطابت کی تعریف کی اور انھیں بہادر یار جنگ کے خطاب سے نوازا۔

نظام دکن کو نواب مرحوم سے بدظن کرنے کی سازشیں ہوئیں۔ نواب نے ایک موقع پر یہ ظاہر کیا کہ اگر اعلیٰ حضرت کو میرے سیاسی مسلک سے اختلاف ہے تو میں ان انعامات و اعزازات کا جو خدائے قدوس نے شاہان آصفیہ کے ذریعہ مجھے عطا کیے ہیں اپنے آپ کو مستحق نہیں سمجھتا اور پھر وہ رزق مجھ پر جائز نہیں آ جو خدا نے ان کے ذریعے مجھے دیا ہے۔

اور پھر جب دکن میں مجلس اتحاد المسلمین کی تحریک نے زور پکڑا

ادھر حصول پاکستان کے لیے مسلم لیگ میدان میں اتر آئی اور خطابات و سرکاری اعزازات واپس کیے جانے لگے تو بہادر یار جنگ نے بھی یہ بوجھ اتار پھینکا، اور ایک جلسہ میں اس کا اظہار یوں کیا۔

"میرے آشیاں پر بجلی چمک رہی ہے اس کو جل جانے دو۔ تمھارے لیے یہ مبارک فال ہے یہی ابر تمھارے گلشن پر حیات پر برسیں گے۔ اور بہت اس میں بہار آئے گی میں اپنے اجڑے ہوئے آشیانے کی خاکستر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اٹھاؤں گا، ہوائیں چل رہی ہیں ابر چھٹیں گے، آفتاب چمکے گا اور دنیا دیکھے گی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔"

نواب صاحب قرآن حکیم کا درس دیا کرتے تھے اور تاریخ اسلام کے وہ گوشے جو مسلمانوں کے علم میں نہیں ہیں انھیں اپنی تقریروں میں بتایا کرتے تھے۔ وہ درویش خدا مست تھے اقبال کے مومن کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ ان کی ادائیں قلندرانہ تھیں اور ان کا جلال سکندرانہ تھا۔

مدیر نوائے وقت جناب حمید نظامی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"یہ سن کر اقبال سے میری عقیدت بڑھ گئی کہ ان کے مطالعہ نے آپ کی بے یقینی کو یقین کے راستے پر ڈال دیا۔ صحیح کی منزل جس سے آپ اپنے آپ کو محروم سمجھتے ہیں اب زیادہ دور نہیں ہے میں آنکھوں کے بہاؤ کو قلب کا غسل کہتا ہوں خدا آپ کی اس رقت کو بڑھائے۔"

قرآن سے قریب ہونے کی کوشش کیجئے آج کل کے انداز فکر و بیان سے جو لوگ متاثر ہیں وہ تلاوت قرآن کی ابتدائی منزلوں میں کچھ پریشان سے ہو جاتے ہیں وہاں ان کو قرآن سے عدم موانست کی وجہ سے ابتداً تو کچھ بے ربطی، عدم تسلسل اور پراگندہ خیالی نعوذ باللہ نظر آنے لگتی ہے۔ طالب قرآن کی یہی منزل سب سے زیادہ کڑی ہے اگر اس الجھن کو برداشت کر کے وہ آگے بڑھ گیا تو قرآن اس سے خود قریب ہونے لگتا ہے اس کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ اور بلا کسی واسطے کے اس پر کھلنے لگتا ہے ایک اور نکتہ عرض کروں کہ گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال سے ہر عہد کے علماء نے قرآن کو اپنی ضروریات اور اپنے ماحول کے مطابق پڑھنے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر مفسر کا رنگ جدا نظر آتا ہے اور بعض ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ کم فہم لوگوں نے اپنے آپ کو قرآن کا تابع بنانے کی بجائے قرآن کو اپنے دعاوی کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔

نواب بہادر یار جنگ اب ایک خیالی تصویر بن کر رہ گئے یہ تصویر بھی چند ہی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے اور ہمارا شمار تو ان قوموں میں ہوتا ہے جو اپنے عظیم اور رفیع المثال رہنماؤں کی تصویروں کے مٹتے ہوئے نقوش میں رنگ بھرنے کی بجائے انہیں اپنے حافظے سے جھٹک دیا کرتی ہیں۔ بہادر یار جنگ کو بھولنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے تاریخ کے محرکات کو فراموش کر دینا۔ اور پھر بہادر یار جنگ تو ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔

نصیر الدین ہاشمی

نظام کلب کے ممبر

نواب بہادر خاں یا نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے متعلق کچھ صراحت کرنے سے پہلے مجھے ان کے والد کے متعلق دو ایک باتیں لکھنی ہیں۔ واضح ہو کہ راقم کو اپنے بچپن میں اکثر ماہ محرم میں "لنگر" دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ بنظم جمعیت (حضور نظام کی بے قاعدہ فوج) کے ایک جمعدار (افسر فوج) نصیب خاں المخاطب "نصیب یار جنگ" تھے جو اپنی علاقہ کی فوج کے ساتھ بحیثیت افسر اعلیٰ ہاتھی پر عماری[2] میں ساتھ رہا کرتے تھے۔ یہ نصیب یار جنگ بہادر یار جنگ کے والد ماجد تھے۔

اگرچہ بہادر یار جنگ عرصہ تک میرے نام سے واقف نہ تھے

---

[1] محرم کی پانچ تاریخ کو لنگر کی رسم قطب شاہی دور اور آصفی دور میں جاری رہی فوج کے جلوس سے حسینی علم کو نیاز جاتی تھی اس کو لنگر کہا جاتا تھا۔

[2] ہاتھی پر ایک خاص قسم کی کرسی برج نما باندھی جاتی تھی اس کو عماری کہا جاتا تھا یہ حکومت کی جانب سے بطور اعزاز عطا ہوتی تھی۔

مگر میں ان کے نام سے بخوبی واقف تھا۔ کیونکہ بہادر یار جنگ نظام کلب کے ممبر تھے اور مولوی سید خورشید علی صاحب کلب مذکور کے آنریری سکریٹری تھے۔ خورشید علی صاحب کی خانگی محفل میں کبھی کبھی بہادر یار جنگ کا تذکرہ ہو جاتا تھا اور کبھی کبھی بہادر یار جنگ خورشید علی صاحب کے پاس آتے تھے اس طرح میری شکل سے بہادر یار جنگ واقف ہو گئے تھے مگر نام سے عرصہ تک ناواقف رہے۔

۱۹۲۹ء میں میں انگلستان سے واپس ہوا۔ طلبا عثمانیہ یونین کے صدر احمد علی خاں صاحب نے (حال ایم، ایل، اے) یونین کی جانب سے میری تقریر مقرر کی اور میں نے اپنے مضمون کا عنوان "انگلستان اور فرانس کے کتب خانے اور وہاں کا اردو ذخیرہ" قرار دیا تھا۔ جلسہ کی صدارت مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب مرحوم نے فرمائی تھی۔

مخفی نہ رہے کہ مجھے میری کتاب "دکن میں اردو" کے صلہ میں نقد انعام حکومت آصفیہ کی جانب سے دیا جانے والا تھا اور میں نے خواہش کی تھی کہ مجھے نقد انعام کے بجائے ایک سال کے لیے یورپ روانہ کیا جائے تاکہ میں وہاں سے مزید مواد حاصل کروں۔ میری یہ استدعا سر امین جنگ اور سید راس مسعود صاحب (مسعود جنگ) کی وجہ سے منظور ہو گئی اور میرا جانا طے پا گیا۔ اس وقت بعض طلبا عثمانیہ نے اخبارات میں میرے خلاف مضامین لکھے تھے اور مجھے یورپ نہ بھیجنے کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا۔ چونکہ مجھے اپنی کتاب "دکن میں اردو" کے صلہ میں بھیجا جا رہا تھا جس سے جامعہ عثمانیہ کے کسی فرزند کی حق تلفی نہیں تھی اس لیے حکومت نے اخبارات کے

مضامین پر کوئی توجہ نہیں کی۔

بہر حال اس طرح حیدر آباد کے بعض اصحاب علم اخبارات کے غلط بیانات سے متاثر ہو گئے تھے ان میں غالباً بہادر خاں بھی تھے۔ میری تقریر کے جلسہ میں بہادر یار جنگ بھی تقریر سننے اور "نصیر الدین ہاشمی" سے متعارف ہونے کے لیے، باوجود طالب علم نہ ہونے کے شریک ہوئے تھے اور وہ اس تصور میں تھے کہ مقرر چونکہ نصیر الدین ہاشمی انگلستان سے حال ہی میں واپس ہوئے ہیں اس لیے سوٹ بوٹ میں ہوں گے۔ مگر میں اپنے ہمیشہ کے لباس ترکی ٹوپی، شیروانی، دوپرا پائجامہ اور بیدری کفش میں تھا اور بہادر خاں صاحب اس تلاش اور تجسس میں تھے کہ مقرر کی صورت دیکھیں جب جلسہ کا وقت قریب آگیا اور موصوف کو کوئی صورت یورپین لباس میں نظر نہ آئی تو موصوف نے اپنے بازو بیٹھے ہوئے صاحب مولوی عمر یافعی صاحب سے دریافت کیا کہ مقرر صاحب آچکے ہیں۔ یافعی صاحب نے ہنستے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا نصیر الدین ہاشمی یہی تو ہیں۔ اس پر بہادر خاں صاحب نے کہا۔ ارے میں تو ان سے واقف ہوں اور میں مل چکا ہوں۔ مگر معلوم نہیں تھا کہ یہی نصیر الدین ہاشمی ہیں۔

اس طرح بہادر یار جنگ سے میرا تعارف (۱۹۲۹ء) نام کے ساتھ ہوا۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ نواب صاحب جلسہ ہائے میلاد کے مقرر سے آگے بڑھ کر سیاست میں تشریف لائے اور ان کا ہر شخص احترام کرنے لگا کچھ پہلے مجلس بلدیہ کے رکن بنائے گئے۔ اس زمانہ میں ایک دو مرتبہ ملاقات ہوئی تھی میں نے شہر کے بعض امور پر توجہ دلائی تھی۔ اس کو تسلیم کر کے

طنز و مزاح

موصوف نے مجلس کو متوجہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی جہاں کہیں یعنی اکثر مجالس میلاد یا کسی دعوت کی تقریب یا عیدین کی نماز وغیرہ میں ملاقات ہوتی رہی اور بہادر خاں نہایت خلوص اور پُرتپاک طریقہ سے ملتے تھے خصوصاً عید کی ملاقات میں گلے ملتے ہوئے فرماتے تھے کہ مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں آپ کی ہڈیاں نہ ٹوٹ جائیں۔ میں جواب دیا کرتا کہ خلوص کی ملاقات میں ہڈی ٹوٹ نہیں سکتی۔

ایک مرتبہ بہادر یار جنگ نے انجمن ترقی اردو اور ادارہ اردو کو ملانے کی کوشش کی تھی۔ انجمن ترقی اردو کی جانب سے مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب اور ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے ڈاکٹر زور صاحب، عبدالمجید صاحب صدیقی اور راقم الحروف شریک ہوتے تھے۔

مگر چونکہ دونوں اداروں کے مقاصد میں فرق تھا اس لیے بہادر یار جنگ کی کوششیں کارگر نہ ہوسکیں۔ ایک اور واقعہ قابل اظہار ہے۔ مدرسہ دارالعلوم کی نوے سالہ جوبلی ۱۳۶۲ھ میں طلبہ قدیم دارالعلوم کی جانب سے منائی گئی جشن کے انتظامات کا مجھے معتمد بنایا گیا تھا۔ دو اجلاس ہوئے۔ ایک جلسہ کی صدارت نواب مہدی یار بہادر نے جو اس وقت صدر المہام تعلیمات تھے فرمائی۔ اس اجلاس میں بہادر جنگ بھی شریک تھے، اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حکومت کی جانب سے بہادر یار جنگ کی زبان بندی کردی گئی تھی یعنی کسی پبلک جلسہ میں ان کو تقریر کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔ اس موقعہ پر نواب مہدی یار جنگ نے بہادر یار جنگ سے تقریر کرنے کی خواہش کی۔

بہادر یار جنگ نے تقریر کا آغاز اس جملہ سے کیا تھا کہ مجھے حکومت

کی جانب سے تقریر کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ مگر آج حکومت کے ایک صدر المہام کی خواہش پر تقریر کر رہا ہوں اس لیے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ بہادر یار جنگ نے اس جلسہ میں علمی امور اور دار العلوم کی خدمات کا تذکرہ کیا تھا مگر سیاست سے ان کی تقریر خالی تھی۔ افسوس ہے اس وقت کی تقریر قلمبند نہیں کی گئی۔

پھر وہ زمانہ آتا ہے جب کہ نواب بہادر یار جنگ مجلس اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے حیدر آباد کے مسلمانوں کو بیدار کرنے لگے اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ خود اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اکثریت کے مقابلہ میں ان کو کامیابی نہیں ہو سکتی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مشن کو یعنی مسلمانوں کو فوقیت دینے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ ایم نرسنگ راؤ اور نواب صاحب کی مراسلت جو نرسنگ راؤ صاحب کے اخبار "رعیت" میں شائع ہوتی رہی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ مراسلت دونوں فرقوں کو ملانے کی تھی بالآخر ناکام ہو گئی۔ ممکن تھا کہ اگر بہادر یار جنگ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو غالباً نصف نصف پر رضامند ہو جاتے اور حیدر آباد میں پولیس ایکشن نہ ہوتا۔ نواب صاحب کی جس رائے کا میں نے اوپر اظہار کیا ہے اس کے ثبوت میں غلام احمد صاحب وکیل نظام آباد کا موسومہ خط پیش کیا جاتا ہے جو تاریخ جنگ آزادی کے زمانہ میں دستیاب ہوا تھا درج ذیل ہے۔

"والسلام علیکم! آپ کا والہانہ اور پُر جوش خط پہنچا جس کا ایک ایک لفظ میرے قلب و دماغ کیلئے نشتر تھا، ہر لفظ سے اتفاق ہے اور ہر حرف پر صاد کرتا ہوں، دل چاہتا ہے کہ

جذبات کو صفحۂ قرطاس پر لاؤں احتیاط گریباں گیر ہے، لیکن سنیے کہے دیتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ حکومت میری نہیں ہے، میں جانتا ہوں اس کو اسلامی حکومت کہنا اسلام کے لیے باعث ننگ ہے۔ مجھے معلوم ہے خاک حجاز اقبال کے الفاظ میں خشت کلیسا بن گئی ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری ساری امیدوں کا مرکز اور ساری آرزوؤں کا آخری ٹھکانہ مجبور اور دوسرے کے اشارے کا محتاج ہے میں اس کو بھی سمجھتا ہوں کہ بالآخر مجھ کو شکست ہوگی۔ حیدرآباد کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے جائے گی اور ہندوستان کے سمندر میں حیدرآباد ایک موج کی طرح لہرائے گا۔ دو سو برس کے حاکم ازلی، ابدی غلام بن جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانوں نے اپنے آپ کو تمام خدائے الٰہی کا مستحق بنالیا ہے۔"

نواب صاحب کے انتقال کے کچھ عرصہ پیشتر جب مولوی احمد محی الدین صاحب ناظم رجسٹریشن و اسٹامپ سررشتہ مالگذاری واپس کردیئے گئے تو میں بحیثیت ناظم رجسٹریشن کچھ عرصہ تک کام کررہا تھا تو اس زمانہ میں ایک گریجویٹ صاحب نواب صاحب کا سفارشی خط اپنے تقرر کے متعلق میرے پاس لائے تھے میں نے نواب صاحب کو ان پر اپنی مشکلات وغیرہ کے واقعات کا اظہار کردیا تھا۔ نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ اس قسم کے خطوط اکثر دے دیا کرتے تھے اس سے ان کا یہ منشا نہیں ہوتا کہ مستحق کو نظر انداز کرکے ان کے سفارشی کا تقرر کیا جائے۔

بہادر یار جنگ میں خلوص تھا قوم سے ہمدردی تھی تواضع اور

منکسر المزاج تھے۔ مسلمانوں کے عروج کے خواہاں تھے۔ میر عثمان علی خاں کو خود مختار بادشاہ دیکھنے کے متمنی تھے۔ وہ اس امر کے خواہش مند نہیں تھے کہ حیدرآباد میں خود حکمراں بن بیٹھیں۔ مگر آصف جاہ سابع کے گرد و پیش کے مصاحبوں نے بہادر یار جنگ سے حضور کو بد دل و بد ظن کر دیا تھا اور وہ ہر وقت بہادر یار جنگ سے بد گمان اور خائف رہے۔ بعض اصحاب کا خیال تھا کہ بہادر یار جنگ کی موت زہر سے ہوئی تھی۔

بہادر یار جنگ کے جنازہ میں جو مجمع تھا اس قدر مجمع حیدرآباد میں بہت کم دیکھا گیا تھا۔ مرحوم کی سیاسی حیثیت کے قطع نظر ان کی ادبی حیثیت بھی شاندار ہے ان کے تحریرات ان کے خطبے اردو ادب کا قابل قدر نمونہ ہیں۔

نواب سر نظامت جنگ

نواب بہادر یار جنگ

نواب بہادر یار جنگ ایسے دور میں پیدا ہوئے جب کہ ایسی نادرۂ روزگار ہستیوں کا جنم لینا ناممکنات ہی میں شمار ہو سکتا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک مصلح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاندار ماضی کے دور کی شخصیت بھٹکتی ہوئی ہمارے دور میں چلی آئی ہے۔

حیدرآباد کے لیے یہ ایک خوش بختی بلکہ خدا کی خاص رحمت تھی کہ

زوال و انحطاط کے دور میں محمد بہادر خاں جیسی شخصیت نے جنم لیا۔

ظاہر بین اور فکر عمیق سے عاری لوگوں کو بہادر خاں شاید ایک ہٹ دھرم اور غیر حقیقت پسند سیاسی لیڈر نظر آتے ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سچے اور مخلص امن پسند سیاستداں تھے۔ بہتر زندگی کے قرآنی تصور کے ایک سچے نمائندہ۔

ان کی زندگی اور اندازِ فکر کے متعلق اپنی شخصی اور ذاتی معلومات کی بنا پر میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی کے کسی لمحہ اللہ کے اس حکم سے غافل نہیں رہے کہ "زمین پر فساد مت پھیلاؤ" وہ امن کے پیامی اور پرستار تھے اور اپنی صفت کا ثبوت انھوں نے شہر حیدرآباد میں ایک مہیب ہندو مسلم فساد کی آگ کو ٹھنڈا کر کے پیش کر دیا۔

اپنی پُرزور قیادت اور پُرجوش خطابت کے باوجود ان کا ذہن اور ان کا دل ہمیشہ ایمان و ایقان اور مذکورہ حکم خداوندی کی تعمیل کے جذبے سے آباد رہا۔ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ایک نیک مقصد کی خاطر لڑنے کو وہ ہمیشہ مستعد رہتے۔ مگر یہ لڑائی جنگ نہ ہوتی۔ ان کی لڑائی حق و صداقت اور امن کی خاطر ہوتی۔ اس حق پسند اور پرامن ماحول کی خاطر جو قوم کی سماجی اور سیاسی بہتری کے لیے لازمی ہے۔

بنیادی طور پر وہ اصطلاحی قسم کے سیاست داں اور سیاست کار نہیں تھے۔ مگر جب وہ سیاسی پلیٹ فارم پر آتے تو وہ لہجہ اختیار کیا جس کی لوگ سیاستدانوں سے توقع رکھتے ہیں اور پھر ان کی شانِ خطابت اپنے سامعین کو چھوٹے چھوٹے سیاسی مناقشوں سے بلند بہت بلند

بھلے جاتی ہے۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی روح، ان کا ذہن اور ان کا دل اس جلوے سے بیتاب تھے ایک پرشکوہ جلوہ ایک شاندار مستقبل کا جلوہ جو ابھی بہت دور تھا۔ وہی جلوہ ان کی ذات میں مجسم ہوگیا تھا۔ ایسا جلوہ جو تھوڑی دیر کو نظر آیا۔ دیکھنے والی نظروں کو چکا چوند کیا اور غائب ہوگیا۔

ان کی اعلیٰ صلاحیتوں، گفتار اور کردار کی غیر معمولی خوبیوں کے ساتھ ہی یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے سرزمین دکن میں جنم لیا۔ گویا قدرت نے بہادر یار جنگ کو اس سرزمین سے یہ بتلانے کے لیے اٹھایا کہ اس کی تاریک گہرائیوں میں کیسے بے بہا جواہر چھپے ہوئے ہیں۔

میں نے نواب بہادر یار جنگ کے دادا کو دیکھا ہے۔ ان کے والد سے ملتا رہا ہوں اور خود انھیں بچپن سے دیکھا۔ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی۔ درسی تعلیم کوئی قابل ذکر نہیں۔ لڑکپن میں وہ بالکل ہی گمنام رہے مگر جب ان کے جوہر کھلے تو دیکھنے والی نظریں خیرہ ہوگئیں۔ ان کا کالج کون سا تھا؟ ان کی جامعہ کیا تھی؟ فطرت اور زندگی ــــ یہی جامعہ تھی جس نے ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔

بہادر یار جنگ کی ذات ان کے کارناموں اور ان کی قدر و قیمت کے متعلق میں نے اپنے تاثرات ان چند جملوں میں بیان کر دیے تھے جو ان کی موت پر بے اختیار میرے قلم سے نکلے تھے۔

"ایک جری اور حق پسند رہنما جسے قدرت نے قلوب انسانی کی

رہبری کے لیے بھیجا تھا۔ ان کی آواز غرور و قوت کی نہیں عظیم اعمال اور بلند مقاصد کی آواز تھی ان کا ہر لفظ ایک سچے اور مخلص دل کی صداقت اور نور کا آئینہ دار تھا۔ رات کی تاریکیوں میں انھوں نے سحر کا جلوہ دیکھ لیا تھا۔ اور اپنے لیے زندگی کی وہ راہ اختیار کی جو موت کو بھی شکست دیتی ہے۔"

جناب فقیر سید وحید الدین

لاہور کے تاریخی اجلاس میں

۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کا یہی وہ یادگار موقعہ اور تاریخی اجتماع تھا جہاں مجھے سب سے پہلے نواب بہادر یار جنگ بہادر کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ میرے عزیز سید امجد علی جو آج کل اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے ہیں۔ نواب صاحب سے بے حد متاثر تھے انھوں نے متعدد بار نواب صاحب کی تقریریں سنی تھیں۔ عزیزی سید امجد علی بہادر یار جنگ کی تقریر و خطابت کا ذکر اس انداز میں کیا کرتے تھے۔ جیسے نواب صاحب نے اپنی تقریروں کا نشہ انھیں گھول کر پلا دیا ہے۔ ان کے اصرار اور شوق دلانے پر میں بھی جلسہ گاہ پہنچا۔ میرے دوست ملک محمد امین ایڈوکیٹ اپنی محبت سے میرے ساتھ ہو لیے۔ کئی معرکہ آراء تقریروں کے بعد سادہ مگر دیدہ زیب مشرقی

لباس میں حیدر آبادی شیروانی، دوہرا پائجامہ اور ترکی ٹوپی پہنے ایک صاحب مائیک پر آکر کھڑے ہو گئے۔

اس سے پہلے جن مقررین نے تقریریں کیں تھیں۔ اُن کا نشہ دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور کسی کسی نے تو واقعی دماغوں کو مسحور کر دیا تھا۔ چنانچہ میرے دوست ملک محمد امین نے میرے کان میں کہا، ایسی اچھی تقریروں کے بعد یہ مولوی آکر کھڑا ہوا ہے سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ چلو واپس چلیں۔

میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ نہیں بھئی امجد علی نے ان کی تقریر کی بہت تعریف کی ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر سنیں گے پسند نہ آئی تو چلے جائیں گے۔ بہادر یار جنگ نے تقریر شروع کی تو لوگ تھکے تھکے سے تھے۔ کچھ جمائیاں لے رہے تھے۔ مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بہادر یار جنگ کی تمہید ہی نے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ نواب صاحب کا بلند بالا قد بھرا ہوا بدن کھلتی ہوئی سرخ و سپید رنگت، اس پر چہرے پر داڑھی کیا بہار دے رہی تھی۔ آواز شیریں مگر اس میں جھنکار بھی تھی اس قدر جاذب نظر شخصیت کے ساتھ ان کا زور خطابت، جوش تقریر، انداز کلام، سارا مجمع ہمہ تن گوش بلکہ بت بنا ہوا وہ ڈیڑھ گھنٹہ تک فصاحت و بلاغت کی شبنم برساتے رہے۔ مگر دل ہی چاہتا تھا کہ خدا کرے یہ سلسلہ ابھی اور جاری رہے۔ یہ "لے" ٹوٹنے نہ پائے۔ بعض وقت تو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ان کے آتش کدۂ دل سے شعلے نکل کر ہواؤں میں تحلیل ہوئے جا رہے ہوں۔ انھوں نے سچ مچ سب کے دل اپنی مٹھی میں لے لیے تھے اور

جدھر چاہتے تھے گھما دیتے تھے۔

قیام لاہور کے دوران نواب بہادر یار جنگ کو کئی روز تقریریں کرنا پڑیں متعدد اداروں میں ان کو مدعو کیا گیا۔ کوپر روڈ پر گرلز کالج میں بھی ایک اجتماع ہوا۔ میں اور امجد علی جب وہاں پہنچے تو جلسہ کا جغرافیہ یہ تھا کہ طالبات و خواتین ایک لان پر ڈائس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے ایسا پردہ تھا کہ پس پردہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پردے کے اس طرف نواب بہادر یار جنگ اور مرد مہمانوں کی نشستیں تھیں۔ مردوں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ گنے چنے چند لوگ تھے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مرد سامعین میں سر عبدالقادر، خان قربان علی خاں، سید امجد علی کے علاوہ دو تین مہمان اور ہوں گے۔

بہادر یار جنگ نے تقریر شروع کی اور سب سے پہلے مرد و زن کے اس جدا جدا انتظام و نشست اور پردے کے اس اہتمام کو مسلمانوں کی قومی غیرت اور خواتین کی اخلاقی برتری کے لیے فال نیک قرار دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میری دعا ہے کہ اخلاق کی پستی اور اخلاق کی بلندی کے درمیان یہ پردہ اور مضبوط ہو جائے۔ اسے کسی قیمت پر بھی نہ اٹھنے دیجئے۔ انھوں نے طالبات کو بڑی مفید نصیحتیں بھی کیں۔ فضول خرچی سے اجتناب کرنے کے متعلق نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"لڑکیاں ضرورت سے زیادہ لباس نہ پہنیں۔"

تو اس پر سر عبدالقادر فوراً بول اٹھے۔

"حضرت! ان کو یہ بھی نصیحت فرمایئے کہ ضرورت سے کم بھی نہ پہنیں۔"

"سر عبدالقادر جیسے دانشور دوست سے مجھے اسی قسم کے ریمارک کی توقع تھی!"

یاد رہے کہ اس زمانے میں خواتین کا یہ رجحان تھا کہ ملبوسات کا عرض وطول وافر ہونا عورت کی جامہ زیبی اور خوبصورتی میں اضافہ کرتا تھا۔ آج کل کی طرح حسن وکشش کا دار و مدار لباس کی انتہائی اختصار پسندی میں نہ تھا۔

آج عریانی فیشن میں داخل ہے اس وقت عیب سمجھی جاتی تھی اب سوچتا ہوں سر عبدالقادر آج زندہ ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان کے دل میں ۳۵ سال پہلے جو خطرہ گذارہ تھا وہ غلط نہ تھا۔

وحیدالدین خاں بوزئی

تیری یاد باقی تیرا غم سلامت

۲۵ رجون ۱۹۴۴ء کی شب کو حیدرآباد کے کوچہ و بازار میں نہ جانے کس طرح یہ خبر سننے میں آئی کہ بہادر یار جنگ کا انتقال ہوگیا۔ اس اطلاع کو صحیح سمجھنے میں ہر ایک کو تامل ہوتا تھا۔ اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس طرح اچانک کس طرح انتقال ہوگیا۔ لوگ اس اطلاع پر رونے پیٹنے یا ماتم کرنے کے بجائے کچھ مبہوت سے ہو جاتے تھے اور سننے والوں میں حیران

پاس کے ساتھ ساتھ گمبھیر خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ باوجود کوشش کے دل اس اطلاع کو صحیح ماننے پر مائل نہ ہوتا تھا۔

بہادر خاں مرحوم بڑے قد آور انسان تھے ان کی صحت جسمانی دیکھ کر رشک ہوتا تھا۔ ایسا انسان دیکھتے دیکھتے آنکھوں کے آگے چل بسے یہ بات بڑی پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ ان کی موت کی اطلاع حیدرآباد کے گوشہ گوشہ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پھیل گئی اور ہر شخص کو تعجب ہونے لگا لوگوں نے کچھ ہی گھنٹے پہلے انھیں توانا، تندرست، چاق و چوبند دیکھا تھا۔ پھر یکایک یہ کیا ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

پوچھ گچھ کا سلسلہ چلا، بھاگ دوڑ ہوئی بات میں سے بات نکلی تو کچھ ایسی باتیں سننے میں آئیں اور کچھ ایسے حالات نظروں کے سامنے لائے گئے کہ ان کی موت کی گتھی سلجھتی ہوئی معلوم ہوئی۔

اس شام وہ حیدرآباد کے ایک بہت بڑے عہدیدار کے پاس رات کے کھانے پر مدعو تھے مغرب کی نماز انھوں نے اپنے گھر پر پڑھی اس سے پہلے "بیت الامت" میں درس اقبال میں شریک رہے جہاں اقبال کی مشہور مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے مضامین پر شرکائے محفل کے آگے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی اور اس محفل سے اٹھ کر نہ جانے کیوں اقبال کا مصرعہ "حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں" گنگناتے ہوئے جوبلی ہل کی طرف چلے جہاں جسٹس ہاشم علی خاں نے خاص ان کے اعزاز میں ایک دعوت ترتیب دی تھی۔ جب وہ اپنے میزبان کی کوٹھی پر پہنچے تو انھیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسلامیان ..... ارض ہند کا یہ قائد جس

کے چہرے پر کڑی سے کڑی مصیبت میں بھی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو دس کروڑ مسلمانانِ ہند کا تابناک ستارہ تھا۔ یوں ہشاش بشاش چاق و چوبند موت کے گھاٹ اتر دیاروں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر کوئی اس وقت اہالیانِ محفل سے یہ کہہ دیتا کہ چند لمحوں کے اندر اندر یہ ٹھٹھی شیریں مقال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہونے والا ہے تو شاید لوگ اسے مخدوش کی بڑ سمجھ کر ہنس پڑتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ آراستہ اور پیراستہ کوٹھی جہاں برقی قمقموں کی آب و تاب نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس مردِ مجاہد کے لیے قبر کے پہلوؤں کا کام کرنے والی تھی

میزبان نے تردد کر استقبال کیا، مہمان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، انہیں صدر میں جگہ دی گئی، لوگ ان کی طرف ہمہ تن گوش ہو بیٹھے اور انھوں نے حسب دستور محفل آرائی شروع کی۔ چند باتیں، کچھ جملے، وہی اقبال کا ذکر اور اسلام کی فکر کرتے میں کسی نے حقہ ان کے آگے رکھا۔ انھوں نے پوچھا یہ کیا، کسی نے کہا دسترخوان بچھنے میں کچھ دیر ہے، اس وقت تک کے لیے معروفیت کا ایک سامان ہے، نہ جانے یہ کس کی آواز تھی بعد کے واقعات نے بتایا کہ جیسے عزرائیل بول رہا ہے کیونکہ یہ حقہ اس محفل سخن میں پیام موت بن کر آیا، نواب مرحوم نے اسے تھوڑا کر نیچے منہ میں رکھا ایک کش منہ میں لیا تو ان کے چہرے کی رنگت کچھ بدل گئی، دوسرا کش لیا تو روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔ لوگوں نے تردد کر جو الا محفل پر ایک گہری خاموشی طاری ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کے چہرے پر ایک سیاہ نقاب پڑ گیا اور ان کے عقیدت مندوں کی نگاہیں مبہوت، چہرے ماتم گسار

اور قلوب مدفن بن گئے۔

ڈاکٹر آئے گئے اور تحقیق ہوئی کچھ اعلان چھپے کچھ اطلاعیں ملیں کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ کہا اخباروں پر پابندیاں لگ گئیں، خفیہ پولیس کے آدمی ہر طرف پھیل گئے۔ حکومت نے اعلان کیا کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہوئی۔ پس پردہ محرکات کے بارے میں عوام کو کچھ معلوم نہ ہو سکا آج تک صحیح واقعات پردۂ راز میں ہیں اور کوئی بھی کھل کر یہ نہیں بتا سکتا کہ اس رحیم ملت کی شہادت میں کس کس کا ہاتھ تھا۔ ڈوریاں کہاں سے کھینچی گئیں، تہلکے کس نے آگے بڑھائے سازشیں کس طرح ہوئی اور تکمیل کو کس نے پہنچایا۔ ڈاکٹروں نے کہا سخت قسم کا زہر تھا جو حقہ کے خمیر میں ملا دیا گیا تھا۔ خدا جانے یہ بات کہاں تک سچ ہے ان کی سیاسی مصروفیات ان کی بے پناہ مقبولیت اور مسلمانان ہند کے قلب و دماغ پر ان کی چھائی ہوئی شخصیت کا خیال آتا ہے تو دل آپ ہی کہہ اٹھتا ہے کہ یقیناً ان کی آواز حق نے ایوان حکومت، وائسرے گیل ہال اور ملک کے جاگیرداروں کے ایوان ہائے عشرت میں ایک غلغلہ ڈال دیا تھا۔ وہ باطل کے مقابلہ میں ایک آہنی دیوار تھے اور ہزاروں فرعونوں کے درمیان ایک موسیٰ جو اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر طاغوتی قوتوں کو روندتے ہوئے اپنی منزل مقصود کی جانب امتحان و آزمائشوں کو دعوت مقابلہ دیتے ہوئے جرأت اور بہادری کے ساتھ بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ عوام کی عقیدت عوام کا خلوص اور عوام کی ارادت تھی ان کے مقابل اپنوں اور غیروں کی سیاسی فریب کاریاں سرمایہ کی عیاریاں تھیں حکومت حیدرآباد کو ان [illegible] رعایا کو والستگان دولت

آصفی کا یہ نمائندہ جو عدالت المسلمین کی نگاہوں میں قدر و منزلت اور محبوبیت اور مقبولیت کے اس درجہ پر پہنچ رہا ہے جس کے آگے قیصر و کسریٰ کی بادشاہتیں بھی سرنگوں ہو جاتی ہیں برطانوی سامراج یہ دیکھ رہا تھا کہ جمال الدین افغانی کا پیام اور اقبال کا خواب جو برسوں سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا اس مرد مجاہد کے جوش کردار سے حقیقت کا روپ دھارنے لگا ہے اور ہمالیہ کے اس سرے سے اُس سرے تک عبدالوہاب کی تحریک سے مسلمانوں کے دلوں میں عزائم جہاد پھر سے پیدا ہونے لگے ہیں۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں ان کی آتش نوا خطابت نے خود شناسی اور خود نگہداری کا وہ احساس پیدا کر دیا تھا جس کے آگے دو دہائی طلسم اور فرنگی مکر تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ چکے تھے اقبال نے چاہے کسی وقت کے لیے کہا ہو لیکن یہ شعر ؎

صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
خوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اس حقیقت کو کھیا دلی کی سیاست نے دور سے سمجھا نہیں تھا بلکہ قریب سے دیکھا تھا۔ برطانوی ہند کے محکمہ سیاسیات کے ایک مشہور مدبر سر فرانسس ویلی نے اپنی حکومت کو اچھی طرح بتا دیا تھا کہ حیدرآباد کے اس جاگیردار کے قلب میں خالد کا عزم اس کی نظر میں صلاح الدین ایوبی کا عروج اور اس کی فرزانگی میں ٹیپو کی تلوار کی جھنکار ہے۔

اُن میں کا ہر فرد فرعونی سیاست کے لیے ایک موسیٰ تھا۔ چہ جائیکہ یہ گلیم پوش تخت نواز کہ جس کے پیکر میں مسلمانوں کے تین جلیل القدر

فرزندوں کی فکر و نظر سموئی ہوئی تھی۔ اس مردِ حق کی زندگی افرنگی سیاست کے لیے ایک مستقل دعوت پیکار تھی۔ اسے نہ ڈرایا دھمکایا جا سکتا تھا نہ کسی صورت میں خریدا جا سکتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جہاں اس کے ضمیر کی کش مکش کے امتحان کی صورت پیدا ہوئی تو اس دیوانہ کو سے محبت نے جیب و داماں کی فکر سے آزادی کو حضوری پر ترجیح دی اور اپنے آپ کو وہ طائر لاہوتی ثابت کیا جسے کسی قیمت پر اپنی پرواز میں کوتاہی منظور نہ تھی یوں تو تیرہ سو برس بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر حضرت ابوبکرؓ کی وہ سنت دیکھنے میں آئی جہاں مقصد کے خلوص پر زندگی کے سارے عیش و آرام کو تج دیا جاتا ہے۔ سر اکبر حیدری کے دورِ وزارت میں نواب صاحب کی سیاسی معروفیات کی بناء پر ایک مرتبہ ان کی زبان بندی کی گئی اور دوسری مرتبہ ایک فرمان کے ذریعہ نظام دکن نے ان کے سامنے دو صورتیں رکھیں کہ یا تو بحیثیت نمک خوار دولتِ آصفی حکومت سے دیئے ہوئے اعزاز و اکرام جاگیر و مناصب سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں اپنے دنیوی جاہ و جلال کو باقی رکھیں یا پھر قوم و ملک کی خدمت کو شعار بنائیں اور حکومت نظام کی دی ہوئی گراں بہا جاگیر و منصب سے دستبردار ہو جائیں، نظام کی عطا کردہ جاگیر سے ان کی سالانہ آمدنی ۱ الاکھ سے بھی کچھ اونچی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کی کشتی فرنگی سیاست کے چکر میں ہچکولے لے رہی تھی اور قائد اعظم کی ذات کو بہادر یار جنگ کی شعلہ نوائی سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں وہ انھیں ہندوستان میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ

مخلص خدا شناس اور حق گو خدمت گذار اور اپنا سب سے معتمد رفیق سمجھتے تھے، نواب مرحوم اس وقت شولاپور، پٹنہ، لاہور، مدراس، الہ آباد دہلی، کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں لاکھوں بندگان خدا کے قلوب متاثر کر چکے تھے۔ ان کا تقدس، ان کا خلوص، ان کا جذبۂ خدمت گذاری اپنی نظیر آپ تھا اور بجا طور پر ان کی زبان و بیان اور ان کی فکر و نظر سے مسلمانان ہند کا مستقبل وابستہ تھا۔ کیا اس موقع پر اپنی جاگیر اور مناصب کو برقرار رکھنے کے لیے دینوی اعزاز و اکرام سے متمتع ہونے کی خاطر وہ سیاست سے کنارہ کش ہو جائے؟ بہادر مال کے لیے یہ ایک معمولی امتحان تھا۔ صرف اپنی جاگیر کی خاطر ملک و ملت کی خدمت سے روگردانی انھیں گوارا نہ ہوئی اور خدمت گذاری کے اس جذبے کے ساتھ اس دعوت امتحان میں انھوں نے خود آگے بڑھ کر نظام کو اپنی جاگیر اور منصب واپس کر دی، اور اسٹیٹس مسلم لیگ، آل انڈیا مسلم لیگ مجلس اتحاد المسلمین کی تنظیم کے لیے سربکف آگے بڑھ گئے ان کی جاں سپاری اور خدمت شعاری کا یہ جذبہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتا ہے حکومت کا غرور اس شان استغنا کو برداشت نہ کر سکا۔

برطانوی سامراج اور چند موقع پرست عناصر کے جوڑ توڑ سے مسلمانوں کو ۲۵ جون کا یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا اور افسوس کہ مسلمانوں کا یہ قائد جس کی زندگی سے مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کی لہر دوڑ گئی ایک شام پراسرار طریقہ پر ہمیشہ ہمیشہ کیلیے خاموش ہو گیا۔

تری یاد باقی ترا غم سلامت ٭ بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں

سید ہاشم رضا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

دکن کی مردم خیز سرزمین سے یوں تو بہت سی معروف شخصیتیں ابھریں لیکن جن تین شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا ولی دکنی، ٹیپو سلطان اور بہادر یار جنگ تھے۔ بہادر ٹیپو سلطان کے مزار پر جب مسلمانوں کا ایک بہادر سپاہی یعنی مولانا محمد علی جوہر فاتحہ کے لیے پہنچا تو یہ بند کہا ؎

دکھائے اس نے شجاعت کے بے بہا جوہر
ادھر وہ یکہ و تنہا خدائی ساری اُدھر
وہ کیا کرے کہ نہ ہو جس کا آسماں یاور
شکست و فتح تو تھی منحصر مقدر پر
کچھ اس میں شک نہیں اس نوجواں نے خوب کیا
مقابلہ تو میرے پہلواں نے خوب کیا

اس نوجوان کا مشن جو ادھورا رہ گیا تھا دکن کے دوسرے نوجوان یعنی بہادر یار جنگ نے آگے بڑھایا لیکن صد حیف کہ چالیس برس کی عمر ختم ہونے سے پہلے ہی بہادر یار جنگ نے داعی اجل کو لبیک کہا زندگی کے اس خلیل عرصہ میں انھوں نے وہ کارہائے نمایاں کیے کہ جن کی یاد صدیوں قائم رہے گی۔

مرحوم کو میں نے صرف ایک مرتبہ دیکھا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سشن میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے تھے لیکن ان کو ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد ہزاروں مرتبہ ان کی تصویر میری آنکھوں میں گھومی ہے۔ ایک ہی پلیٹ فارم پر ان کا اور قائد اعظم کا ساتھ قِران السعدین کے مترادف تھا۔ ایک آفتاب تھا اور ایک ماہتاب میری آنکھوں نے پھر ایسا جلوہ نہیں دیکھا۔

ہمارے رسول کریم صلعم کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے انگریزی تاریخ داں گبن نے لکھا تھا کہ منجملہ اور صفات کے رسول کریمؐ کو اللہ نے ذاتی وجاہت سے نوازا تھا اور یہ وہ صفت ہے جس کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے بجائے اس کے جو اس سے محروم ہو۔ رسول کریمؐ کے غلاموں میں قائد اعظم محمد علی جناح اور قائد ملت بہادر یار جنگ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے وجاہت سے نوازا تھا اور یہ وہ صفت ہے جس پر "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" کی مثل صادق آتی ہے۔

مسلم لیگ کے عام سشن میں قائد اعظم اس رات مغربی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے اور میں نے بہت کم ایسے انگریز دیکھے ہیں جن پر مغربی لباس قائد اعظم سے بہتر سجتا ہوا نظر آیا ہو۔

بہادر یار جنگ مشرقی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ شیروانی چوڑی دار پاجامہ اور اونچی ٹوپی دونوں بلند قامت تھے، دونوں سرخ و سپید تھے۔ جیسا زور خطابت انگریزی قائد اعظم نے دکھایا۔ ویسا ہی زور خطابت اردو میں بہادر یار جنگ نے دکھایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا دونوں کا دل اور دماغ ایک تھا۔ ایسی ہم آہنگی اس زمانے کے برصغیر کے دو عظیم لیڈروں

میں مشکل سے دیکھنے میں آتی تھی۔

بہادر یار جنگ کی ناگہانی موت کی خبر نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو تڑپا دیا۔ حیدرآباد کے مسلمانوں پر کیا گذری ہوگی یہ تو ان ہی کا دل جانتا ہوگا۔ میرے خیال میں زوالِ حیدرآباد دراصل اسی دن شروع ہوا جس دن بہادر یار جنگ کی آنکھیں بند ہوئیں۔ یعنی ۲۵ جون ۱۹۴۴ء سے میں نے انھیں کفن کے لباس میں نہیں دیکھا۔ لیکن جن لوگوں نے ان کی زیارت ان کے آخری لباس میں کی تھی وہ کہہ سکتے تھے کہ ؎

جب تک میں تھا عروج پہ تھا حسنِ جانستاں
پھر کچھ خبر نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا

انھوں نے جس تاثر کا ذکر مجھ سے کیا اس کی تصویر مرزا یاس یگانہ کے اس شعر میں ہے ؎

جامہ زیبوں پہ کفن نے وہ ڈھایا جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

غالب نے بھی انہی جیسے کسی مرنے والے کو دیکھ کر یہ شعر کہا ہوگا ؎

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

ان کی زندگی وہی تھی جو ایک مردِ مومن کی ہونی چاہیے۔ دل میں خدا کا خوف تھا، سینے میں عشقِ رسولؐ تھا اور دماغ میں ہر وقت ملت اسلامیہ کی خدمت کی تڑپ۔ ان کی اولین شہرت کا سبب ان کی وہ تقریریں تھیں جو انھوں نے عید میلاد النبیؐ کے سلسلے میں پہلے حیدرآباد اور پھر

سارے ہندوستان میں کیں۔ اُن کو سننے کا اشتیاق برصغیر ہندوستان و پاکستان کے ہر علاقہ کے مسلمانوں کو تھا، اور ربیع الاول کے مہینے میں ان کے لیے یہ مشکل درپیش ہوتی تھی کہ کہاں جائیں اور کہاں نہ جائیں کیوں کہ روزانہ دعوتی خطوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ ملت اسلامیہ کی خدمت کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں غیر مسلموں کے اسلام کے دائرے میں لے آئے۔ انھوں نے مجلس اتحاد المسلمین میں روح پھونک دی۔ خود اپنے گھر کو 'بیت الامت' بنا دیا۔ یہ گھر انھیں اپنے آباو اجداد سے ورثے میں ملا تھا جو ریاست حیدرآباد کے مقتدر جاگیرداروں سے تھا۔ اپنے حسن انتظام سے انھوں نے اپنی جاگیر کی آمدنی کو بڑھایا۔ یہ آمدنی انھوں نے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے کم اور مستحق مسلمانوں کے لیے زیادہ استعمال کی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد وہ اپنے لباس پر سارے سال میں صرف سو روپے خرچ کرتے تھے۔ عزت نفس کا یہ عالم تھا کہ جب انھوں نے محسوس کیا کہ جاگیریں ان کی آزادی میں حائل ہیں تو جاگیروں منصب و اکرام سے دستبردار ہو گئے۔ نواب بہادر یار جنگ سے محمد بہادر خاں ہونے پر سبکدوشی محسوس کرنے لگے۔ مرحوم کی کوئی اولاد نہ تھی اور اپنے مال کو جس طرح انھوں نے اپنے اصولوں پر قربان کیا اس کے لیے یہ شعر برمحل ہے ؎

عیال و مال نے روکا ہے دم کو آنکھوں میں
یہ ٹھگ ہٹیں تو مسافر کو راستہ مل جائے

اس قربانی کے بعد وہ یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ ؎

آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں
یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں

قائداعظم اور علامہ اقبال سے انھیں بے پایاں محبت تھی۔ ایک مرتبہ قائداعظم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ:

"ملت اسلامیہ کے اس بے نظیر قائد کی نگاہیں ایک طرف قصر بکنگھم کے ایوان کو توڑتی ہوئی نکل جاتی ہیں اور دوسری جانب وارد ھا کی جھونپڑی کی بنیادیں ہلا دیتی ہیں۔"

ان کا مضمون "جناح پہلی نظر میں۔ ایک تاثر" قائداعظم سے ان کی والہانہ محبت کا آئینہ دار ہے۔ ۱۹۳۴ء میں وہ بمبئی میں ایک عظیم الشان جلسۂ عید میلاد النبیؐ کی صدارت کر رہے تھے کہ:

"جلسہ میں دفعتاً ایک ہیجان پیدا ہوگیا اور لوگوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے جلسے میں چاروں طرف متجسس نگاہ ڈالی اور ایک دبلے پتلے آدمی کو گورے رنگ، اونچی ناک، مضبوط جبڑوں، درخشاں پیشانی اور چوڑے سینے کو چیر کر دلوں تک گھس جانے والی تیز نگاہوں کے ساتھ اپنا مضبوط ہاتھ کھلی ہوئی لمبی لمبی انگلیاں پیشانی سے لگائے صاف ستھرا اور استری کیا ہوا سوٹ پہنے ننگے سر نعروں کا خاموش لیکن دلوں کو موہ لینے والا جواب دیتا ہوا دیکھا، جلسے کے منتظم سیٹھ ذکریا مینار نے مجھے بتایا کہ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح جو کبھی نام نہاد آل انڈیا نیشنل کانگریس کے روح رواں تھے ہندوستانی قومیت کے علمبردار تھے مخلوط انتخاب کے

حامی تھے۔ اور آج مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا، ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا سہارا، کانگریس کے فاتح اور مسلم لیگ کے علمبردار ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا کا سبق پھر ایک مرتبہ پڑھانے کا عزم کر لیا ہے اور سب کی غلامی سے چھوٹ کر محمد الرسول اللہ کے آستانے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔"

علامہ اقبال کے کلام سے اتنی محبت تھی کہ ان کی شاعری اور ان کے پیام پر ہر جمعرات کو بعد نماز مغرب درس دیا کرتے تھے جو لوگ ان کی صحبت سے مستفید ہوئے انھوں نے مجھے بتلایا کہ اقبال کے کلام کے وہ گوشے جو عوام کی نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے بہادر یار جنگ کی وضاحت سے روزِ روشن کی طرح چمک اٹھتے تھے اور ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

کا سماں بندھ جاتا تھا۔

انھوں نے علامہ اقبال کی زندگی ہی میں حیدرآباد میں یوم اقبال منایا اور اس طرح قدردانی کی ایک بڑی اچھی مثال قائم کی۔ ہمارے ملک میں مرنے والوں کو تو سب یاد کرتے ہیں لیکن زندگی میں قدر کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ انیس نے کیا خوب کہا ہے ؎

زندگی میں تو نہ اک دن خوش کیا ہنس بول کر
آج کیوں روتے ہیں میرے آشنا میرے لیے

میں جب راولپنڈی میں تھا تو ہم لوگوں نے "یوم فطرت"

عبدالعزیز فطرت صاحب کی زندگی ہی میں منایا تھا۔ انھوں نے یوٹھوبار کے خطے میں چالیس برس اردو کی بڑی خدمت کی تھی اور خدمت کے اعتراف کے لیے اردو کے قدردانوں نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی تھی۔ انھوں نے دریا دلی سے یہ تھیلی جلسے ہی میں انجمن ترقی اردو کو پیش کر دی۔ اس محفل میں ایک صاحب نے ادیبوں اور شاعروں کی اُن کی زندگی میں ناقدری کا شکوہ اس شعر میں کیا ؎

کب ہوا کامیاب فردوسی
جب وہ فردوس کو روانہ ہوا

ہم لوگوں نے یوم فطرت بہادر یار جنگ کے منعقد کردہ یوم اقبال کی تقلید میں منایا تھا۔

اُن کی قادر الکلامی کے کچھ نمونے پیش کرتا ہوں۔ بزم ادب تیموریہ دہلی نے انھیں "یوم ظفر" میں شرکت کی دعوت دی۔ اس کا جواب بہادر یار جنگ نے یوں دیا:

"یوم ظفر کا دعوت نامہ پہنچا۔ فرزندان تیمور اور بابر کی بیداری میرے نزدیک طلوع صبح ایشیا کے برابر ہے میں اس حرکت پر مبارک باد عرض کرتا ہوں اور شاہان مغلیہ کے عقیدتمند کی حیثیت میں یہ عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں کہ فرزندان تیمور نے جس دن شمشیر و سناں چھوڑ کر جنگ و رباب سے دوستی کی وہی دن ان کی تباہی و بربادی کا دن تھا۔ آج آپ ظفر کی یاد منا رہے ہیں لیکن شاہان مغلیہ کے آخری اور

شمشیر بردار نہیں بلکہ شعر گو بادشاہ کی حیثیت میں۔ میں ان کی یادمنانے کو فرزندانِ تیمور کا اپنی شکست، اپنی ذلت، اپنی رسوائی اور اپنی بربادی کی یادمنانا سمجھتا ہوں۔ مجھے اس بزمِ ادب کی شرکت سے معاف فرمایئے جس سے اندیشہ ہے کہ کہیں بابر اور تیمور کی عظمت کو میرے دل سے مٹادے۔ اُس دن کی تیاری کیجئے جس دن آپ تیمور صاحبقرانی، بابر فاتح ہندوستان، شہنشاہ اکبر اور شہنشاہ عالمگیر کی صحیح معنوں میں یادمنانے کے قابل ہو جائیں۔ آنکھوں سے چلتا ہوا آؤں گا۔ اور اپنی عقیدت کے بوسوں سے آپ کے دست و پا کو رنگین کر دوں گا۔ حاشا و کلّا جو کچھ کہا گیا ہے وہ آپ کی تنقیص کے لیے نہیں بلکہ قلب میں سلگتی ہوئی آگ کی چند چنگاریاں تھیں جو بے ساختہ نکل پڑیں۔ معاف کیجئے آپ کے دُکھے ہوئے دلوں کو اور دُکھانا مقصود نہیں ہے بلکہ مردہ دلوں میں جو شرابِ ادب سے سرمدی موت کا سامان کر رہے ہیں حیاتِ ابدی کے لیے تڑپ پیدا کرنا مقصود ہے۔"

اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے مسلمانوں کے دورِ ابتلا کا ذکر یوں کیا:

"اسلام پر وہ عبوری دور پھر آگیا ہے جب کہ تمام مسائل سے قطع نظر کر کے صرف قَالَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ قَدخل الجنّۃ کے اعلان کی ضرورت ہے شیعیت و سُنیت، بدعت و وہابیت احمدیت و ہندویت سب زمانۂ امن کے لمحاتِ فرصت کی پیداوار

ہیں آج جب کہ خانۂ اسلام کے اطراف بارود بچھی ہوئی ہے اور شعلۂ کفر اس کو بھسم کرنے کی تیاری کر رہا ہے میں کافی سمجھتا ہوں کہ لوگ سب کچھ چھوڑ کر لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پر جمع ہو جائیں۔ مسلمان اپنی زندگی کے کئی دور سے گزر رہا ہے اس کو ہرگز مناقشات میں نہ الجھنا چاہیے اور فی الحال اپنی ساری قوتوں کو وقف تنظیم کر دینا چاہیے۔"

نواب حسن یار جنگ بہادر کو جنھوں نے ان کے ایک عزیز کا پرسہ دیا تھا جس کی ہندو مسلم فسادات میں موت واقع ہوئی تھی یوں جواب دیا۔

"میرے عزیز کی موت کا رنج نہ مجھے ہے نہ آپ فرمائیں۔ میں بھی قابل مبارک باد ہوں اور آپ بھی کہ ہمارے ایک نوجوان نے اپنا فرض ادا کیا۔ اقوام و ملل کی کھیتیاں جناب نواب صاحب! پانی سے نہیں خون سے سینچی جاتی ہیں۔ بڈھے خون سے نہیں نوجوان اور تازہ خون سے۔ افسوس ہے کہ ان کی زندگی پر جن کا خون ان کے اپنے جسم میں خشک ہو جائے اور ملک و ملت کے کام نہ آئے۔"

ایک اور دوست کو لکھتے ہیں:

"اللہ حجروں کی چہار دیواری کے اندر نہیں آفاق کے ذرّے ذرّے میں بیکسوں کی آہ و بکا میں، بے وسیلوں کے نالہ و شیون میں مظلوموں کی کراہ میں، دادخواہوں کی تڑپ میں، اس کے

راستے میں ذلت اور رسوائیوں میں ملے گا۔ باہر نکلو اور دیکھو کہ اشرف المخلوقات انسان، حاملِ بارِ امانت انسان خلیفۃ اللہ انسان، کس طرح ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ اس کی سربلندیوں کا سامان کرو کہ یہی اصل عبادت اور اصل دین ہے میری نہیں سنتے تو سعدی کی سنو ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بتسبیح و سجادہ و دلق نیست

"خدا تم کو اچھا رکھے، اپنی محبت میں ایسا سرشار کرے کہ اس کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کی بے قراری تمھیں تڑپا دے اور گوشۂ عزلت سے باہر کھینچ لائے۔"

سید یوسف بادشاہ حسینی

رہ نوردِ شوق

ریاست حیدرآباد اگرچہ ایک کُلی اسلامی ریاست نہ تھی لیکن بہرحال ایک مسلمان ریاست تھی جس کا سرکاری مذہب اسلام تھا، جہاں کا بادشاہ مسلمان تھا، جہاں مسلمان حکمراں تھے۔ چنانچہ مذہبی تقریبات بڑے اہتمام سے منعقد کی جاتی تھیں۔ عید میلاد النبیؐ کے موقع پر خصوصی اہتمام ہوتا۔ محلہ بازار بازار

سجاوٹ ہوتی۔ گھر گھر محافل میلاد منعقد ہوتیں۔ بڑے بڑے جلسے جلوس کا اہتمام ہوتا۔ محمد بہادر خاں بہادر یار جنگ نے ان ہی محافل و مجالس میلاد سے اصلاح امت اور تنظیم ملت کا کام شروع کیا۔ مسلمانوں کی تنظیم اور اصلاح کے ساتھ ساتھ وہ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ میں پیش پیش رہے اور کم و بیش بیس ہزار متلاشیان حق اور بھٹکے ہوئے انسانوں نے اس مرد حق آگاہ کے ہاتھوں شرف اسلام قبول کیا۔

تنظیم ملت اور تبلیغ اسلام کے سلسلے میں محمد بہادر خاں کی خطابت کا اثر سب سے زیادہ تھا۔ قدرت نے ایک جاگیردار خاندان کے اس نوجوان کو خطابت کی ایک عجیب و غریب طاقت ودیعت فرمائی تھی۔ وہ رسول اکرمؐ کے عشق سے سرشار تھے اور انھیں اس بات کا پورا پورا ادراک و احساس تھا کہ ایک مسلمان کا مقصد حیات صرف اور صرف محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اسلام کو اس دنیا کے رنگ و بو میں نافذ کرنا ہے۔ اگر یہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است اور اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۴۸ ہزار مربع میل پر محیط پوری ریاست کے دورے کیے۔ نواب بہادر یار جنگ نے برصغیر ہندوستان میں ہندوؤں کے رویوں کے پیش نظر مملکتی مجلس اتحاد المسلمین قائم کر کے ریاست میں آباد تمام مسلمانوں کو جو مختلف فرقوں میں منقسم تھے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ اور ان کی اجتماعی تنظیم سے جلد ہی مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں مسلمانوں کی نمائندہ اور مضبوط سیاسی جماعت بن گئی۔

جب نواب صاحب اسلام کی سربلندی کی بات کرتے تو ان کے

پیش نظر صرف ریاست حیدرآباد نہیں ہوتی بلکہ پورا برصغیر ہوتا تھا۔ وہ علامہ سید جمال الدین افغانیؒ کے مسلک علامہ اقبالؒ کے پیغام، ارشادات نبویؐ اور احکام الٰہی کے مطابق اسلامی اتحاد کے نقیب اور علمبردار تھے۔ اسی لیے انھوں نے ریاستی مسلم لیگ قائم کی۔ یہی چیز انھیں مسلم لیگ کے جلسوں میں اور قائداعظم کے قریب لے آئی۔ مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ کے بعد مسلم لیگی قائدین ان سے متعارف ہو چکے تھے اور بمبئی کے چوپاٹی میدان میں ان کی تقریر سن کر قائداعظم نے کہا تھا "مسلم لیگ کو زبان مل گئی"۔

کانگریس کی صفوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے شعلہ بیان اور نشر افشاں مقررین موجود تھے مسلم لیگ اس سے تہی دامن تھی لیکن اکیلے نواب بہادر یار جنگ کی اس قافلۂ حق میں شرکت سے مسلم لیگ کا پلہ بھاری ہو گیا۔

ریاست میں نواب صاحب کا روز افزوں اثر ہندوستان کے طول و عرض میں ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عالمی اسلامی اتحاد کا مسلک، غیر مسلم دنیا اس کے مضمرات سے واقف تھی اور خصوصاً انگریز ——— ؟ جسے پوری دنیا میں اگر کسی سے خطرہ تھا تو وہ مسلمان تھے۔ وہ تازہ تازہ ہی سید جمال الدین افغانیؒ سے فارغ ہوا تھا اور ہندوستان کے جنوب میں واقع سب سے بڑی مسلم ریاست میں دوبارہ اس خطرہ کو ابھرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ تمام دنیائے اسلام کی شکست و ریخت میں

معروف تھا تاکہ ہمیشہ کے لیے اس کے راستے سے یہ رکاوٹ دور ہو جائے اور نواب بہادر یار جنگ احیائے اسلام اور اتحادِ اسلام کا نعرہ اٹھائے للکار رہے تھے ؎

سنا دو یہ غاشاکِ باطل سے جا کر
سنبھل جائیں میں آگ برسا رہا ہوں

پھر ہندو اور انگریز کی مشترک سازش اور سام راج اور رام راج کے ناپاک گٹھ جوڑ نے انگریز ریذیڈنٹ متعینہ حیدرآباد کے ذریعہ نظام الملک آصف جاہ سابع پر دباؤ ڈالا، لہٰذا فرمان نافذ ہوا کہ "کوئی جاگیردار سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا"۔ بہادر یار جنگ نے اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے جاگیردار انعام دار اور منصب دار ساتھیوں سے کہا "میں سب کی طرف سے ایک بڑا صدقہ نکال دیتا ہوں"۔ انھوں نے نظام کو لکھا "آصف جاہی خاندان اور اسلامی ریاست حیدرآباد کی بہی خواہی کے لیے یہ جاگیر اور خطاب مجھے اور میرے وارث اعلیٰ کو عطا فرمائے گئے تھے اور اب اسی مقصد کے لیے میں ان سے دست کش اور دستبردار ہوتا ہوں" ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

جاگیر اور خطاب کی واپسی اور دستبرداری اس مردِ قلندر پر قطعاً اثر انداز نہ ہو سکی کہ "منفعت ایک است آشیانہ" وہ اور زیادہ انہماک و تجمع کے ساتھ کلمۂ حق کی تبلیغ [illegible] کے [illegible]

کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔ ریاستی مسلم لیگ قائم کر کے بہادر خاں نے ریاستی مسلمانوں کو بھی مسلم لیگ کا ہم رکاب کر دیا تھا۔ اب انگریزی استعمار اور ہندو فرقہ واریت ان کے بڑھتے ہوئے اثر اور بے مثال تنظیمی صلاحیت سے خوف کھانے لگے تھے چنانچہ انھوں نے ایک اور وار کیا اور نظام کو مجبور کر کے ان کی زبان بندی کا حکم نافذ کروا دیا۔ لسان الامت کی زبان بندی

میں کیسے اعتبارِ انقلاب آسماں کر لوں

لیکن بطحا کی وادی میں بلند ہونے والی آواز کی بازگشت کب کسی سے رک سکی ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق اور اقامتِ دین کے لیے کھلنے والی زبان کہیں سرکاری احکام سے بند ہو سکتی ہے۔

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ریاست حیدرآباد میں بہادر خاں کی زبان بندی کے ساتھ ہی ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کی آواز سے گونجنے لگا۔ بمبئی، کلکتہ، پٹنہ، لکھنو، دہلی لاہور، پشاور اور کراچی غرض ہندوستان کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ تحریک پاکستان کے اس مبلغ کی آواز سے بیدار اور خطاب کی سحر طرازی سے ہوشیار ہوتا گیا۔ پورے برصغیر ہند میں مسلم لیگ کی بنیادیں مضبوط اور تحریک پاکستان کو عام کرتے ۱۹۴۳ء کے وسط میں بہادر خاں جب حیدرآباد واپس ہوئے تو ان کی زبان بندی تھی۔ پھر ایک روز صبح ہی صبح لوگوں نے حیدرآباد کی دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے دیکھے [illegible] جنگ کی [illegible] واقع یاقوت پورہ میں لسان الامت جلسہ میلاد النبی [illegible]

خاموش صدارت فرمائیں گے۔" لسان الامت خاموش صدارت فرمائیں گے! لوگ جوق در جوق اس جلسے میں پہنچے۔ جلسہ ہوا تقریریں ہوئیں، نظمیں پڑھی گئیں۔ معتمد جلسہ نے جلسے کے برخاست کا اعلان کیا۔ لسان الامت کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ جلسہ کیسے برخاست ہو جائے گا۔ لوگ بیٹھے رہے۔ معتمد نے پھر اعلان کیا "حضرات! لسان الامت قائد ملت محمد بہادر خاں کی زبان بند ہے اس لیے وہ تقریر نہیں فرمائیں گے لہذا جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔" مگر لوگ بیٹھے رہے۔ تب قائد ملت اٹھے مائکروفون کو اپنے مخصوص انداز میں پکڑ کر کھڑے رہے، مجمع کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ تمام مجمع دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پھر لاؤڈ اسپیکر چیخ اٹھے "لوگو میری زبان بند ہے۔ اگر میری زبان بند نہ ہوتی تو میں کہتا۔" اور اسی جملے کی تکرار کے ساتھ دو گھنٹے تک اس نے وہ سب کچھ کہا جو زبان بند نہ ہونے کے باوجود کوئی نہ کہہ سکا تھا۔

بند جن لوٹ گئے زبان بندی واپس لے لی گئی اور لسان الامت پھر انگریز سامراج اور ہندو رام راج کے خرمن اقتدار پر شعلہ افشانی اور شرر باری کرنے لگے۔

مگر گردوں کی آستیں میں چھپی ہوئی بجلیاں جن کی زد سے بہادر خاں مسلمانان برصغیر کو نکال لایا تھا تو اسی کے خرمن ہستی پر لہرانے لگیں پھر وہ ۲۵ جون ۱۹۶۲ء کی شام کے منحوس سائے طویل ہوتے چلے گئے۔ ہاشم علی خاں رکن عدالت عالیہ صدر آباد دکن نے گوالیار اسٹیٹ کے چیف جسٹس کے اعزاز

میں اپنے مکان واقع بنجارہ ہل پر ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ قائد ملت بھی مدعو تھے۔ بیت الامت میں درس اقبال سے فارغ ہو کر دعوت میں پہنچے۔ ارباب دانش اور اصحاب علم جمع تھے۔ فکر اقبال موضوع گفتگو تھی اسی انہماک میں حقہ کی نئے ہونٹوں سے چھو کر ایک ہلکا سا کش لیا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

قائد ملت کا ایک مقصد حیات تھا۔ اعلائے کلمۃ الحق، اقامت دین، نظام مصطفےٰ کا نفاذ اور شریعت محمدی کا اجراء اور اسی کے لئے قائد اعظم سے اپنی بے پناہ عقیدت اور ارادت کے باوجود انھوں نے کہا تھا "اگر محمد علی جناح کی بات محمد الرسول اللہ کے حکم کے خلاف ہو تو مجھے ماننے سے انکار ہے۔ یہ مقصد آج بھی تشنۂ تکمیل ہے۔ اُن کی روح اس مقصد کی تکمیل کی آج بھی آرزومند ہے۔

ہوائے درہ خیبر ہے محو انتظار اب بھی

ابراہیم جلیس

پاکستان زندہ باد

دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان اگرچہ صرف ایک ہی رات میں معرض وجود میں آیا تاہم جب کبھی بھی میں ماضی کے دھندلکوں میں

جھانکتا ہوں تو مجھے مسلمانوں کے اس سب سے بڑے اور عظیم الشان وطن کے نشانات برسوں دور سے نظر آتے چلے جاتے ہیں۔

برسوں دور سرزمین ہمالہ کے دامن میں جناب شہید سلطان ٹیپو کے مقدس لہو کے سرخ سرخ پھول کھلے ہیں، ٹھیک وہیں سے گلستانِ پاکستان کی مہک محسوس ہونے لگتی ہے۔

اس زمانے میں پاکستان کے کئی نام تھے۔

ٹیپو کا قلعہ سرنگاپٹم	پاکستان
سراج الدولہ کا میدان پلاسی	"
بہادر شاہ ظفر کا زندان	"
سرسید کی درسگاہ علیگڈھ	"
حالی کی مسدس	"
محمد علی جوہر کا ہمدرد	"
اقبال کا خواب	"
اور بہادر یار جنگ کی آواز کا شعلہ	"

ہندوستان کے سیاسی اندھیرے میں مسلمانوں کے اقتدار کا پہلا چراغ سلطان ٹیپو شہید کے لہو سے جلا اور اس چراغ کے اُجالے میں سر سید احمد خاں سے اقبال تک، اقبال سے بہادر یار جنگ تک اور بہادر یار جنگ سے قائداعظم تک ـــــ ان محسن رہنماؤں کے قدموں سے مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کا ایک نیا راستہ ہموار ہوتا چلا گیا اور بالآخر یہ راستہ

جب بحیرۂ عرب کے ساحلی شہر کراچی تک پہنچ گیا تو ٹھیک آدھی رات کو اچانک ساری دنیا "پاکستان زندہ باد" کے گرجدار نعروں سے گونج اٹھی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے سورج کا اُجالا پھیلتے ہی دنیا والوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ دنیا کے نقشے پر ایک نیا اور سب سے بڑا اسلامی ملک معرض وجود میں آچکا ہے اور دنیا کے دوسرے سارے ملکوں کے رنگ برنگے جھنڈوں میں ایک نیا سبز ہلالی پرچم بھی بڑی شان سے بلند ہو کر بڑے کروفر سے لہرا رہا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی سرزمین پر ٹیپو کا لہو نہ گرتا۔ سرسید نے درسگاہ علیگڈھ کی بنیاد نہ رکھی ہوتی۔ بی اماں نے محمد علی جوہر کو نہ جنم دیا ہوتا۔ اقبال نغمہ سرا نہ ہوتا اور بہادر جنگ کی گرجدار آواز سرزمین ہمالیہ کو جھنجھوڑتی۔ تو کیا پاکستان بن سکتا تھا۔؟؟

لیکن یہ کیسے بے لوث اور بے نیاز محسن ہیں۔ خود تو دو گز کی مختصر سی قبروں میں سمٹ گئے اور دس کروڑ مسلمانوں کے لیے اتنا بڑا اور ایک عظیم الشان وطن لے کر دے دیا۔ خود ایک نظر بھی اسے نہیں دیکھا!!

میں ہر اس مسلمان کے لیے عقیدت سے اپنا سر جھکا دیتا ہوں جس نے اپنے لہو سے پاکستان کی سرحد کو اور زیادہ تابانی عطا کی ہے خواہ وہ مسلمان ٹیپو شہید ہو خواہ وہ گمنام شہید جو ہندوستان سے پاکستان کے سفر میں ۱۹۴۷ء کے سنگ میل کے آس پاس کہیں بھی شہید ہوا ہو۔

لیکن اس وقت تو میرا سر دوسرے ٹیپو نواب بہادر یار جنگ کے

آگے ختم ہے جن کی آواز کے دہکتے شعلوں نے جہاں غیر ملکی غلامی کی زنجیریں پگھلا دیں وہاں تابناک شعلوں نے پاکستان جانے والے ہر راستے کو فروزاں اور جگ مگ کر دیا تھا۔

پہلے پہلے تو اس کی آواز کی گھن گرج صرف کوہستان بندھیاچل کی وادیوں میں گونجتی رہی لیکن جیسے جیسے یہ آواز جوان ہوتی گئی اس کا جادو بھی سر چڑھتا گیا پھر تو الیورسٹ اور ہندوکش کی چوٹیاں بھی لرزنے لگیں صبح بنگال اور بحیرۂ عرب تک اس آواز نے بلا کا تموج پیدا کر دیا تھا۔ اور اس آواز کو قائداعظم محمد علی جناح تک نے خراج تحسین پیش کیا۔

لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ان دنوں پنجاب میں حکومت اور خاکساروں کی ہنگامہ آرائیوں سے مسلم عوام میں بڑی بے چینی پھیلتی جا رہی تھی مضطرب اور غضبناک مجمع کا سیلاب روکے نہ رکتا تھا۔ یہ افراتفری دیکھ کر قائداعظم کی جبین پر شکن پڑ گئی وہ بڑے غصے سے اٹھے اور اعلان کیا کہ:

اب بہادر یار جنگ تقریر کریں گے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی ایک دم جیسے سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا قد آور بہادر یار جنگ ڈائس پر آئے۔ اپنے نطق معجز اثر سے پردۂ سکوت کو چاک کیا۔ بولنا شروع کیا بولتے گئے اور بولتے چلے گئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیشہ کا بولتا، گونجتا گرجتا لاہور ایک دم گونگا ہو گیا ہے مسلسل سات گھنٹے تک بولنے کے بعد جب بہادر یار جنگ مائیکروفون سے ہٹ گئے اور

منتظمین جلسہ نے قائداعظم سے درخواست کی کہ اب ہم آپ کی مخاطبت کے لیے بے چین ہیں۔ جو قائداعظم اٹھ کھڑے ہوئے مائیکروفون کے سامنے آئے اور صرف یہ جملہ کہہ کر بیٹھ گئے۔

"بہادر یار جنگ کے بعد کسی کا بولنا غلطی ہے۔"

نواب بہادر یار جنگ کو بحیثیت ایک لاثانی مقرر ایک مثالی مرد مومن کون نہیں جانتا البتہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں حاضر جوابی شائستہ مزاحی اور شستہ ظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا وہ زاہد تو بلاشبہ تھے خشک ہرگز نہ تھے۔ ان کی حاضر جوابی کا یہ واقعہ بڑا یادگار ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بہادر یار جنگ بلاد اسلامیہ کے سفر کے دوران قاہرہ بھی تشریف لے گئے وہاں کو ہندی مسلمانوں سے یہ شکایت تھی کہ وہ کلام پاک کا ترجمہ کرنے کی جسارت کرتے ہیں چنانچہ جامعہ الازہر کے پرنسپل صاحب نے بڑے طنزیہ لہجے میں نواب صاحب سے کہا۔

"آپ ہندوستانی مسلمان تو قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں۔"

نواب صاحب طنز کو فوراً بھانپ گئے لیکن بغیر برا مانے نہایت شگفتگی سے بولے۔

"قبلہ۔ ترجمہ تو نہیں البتہ ترجمانی ضرور کرتے ہیں اور ترجمانی میں یقیناً کوئی قباحت نہیں ہے۔"

بہادر یار جنگ کی انگریزی تعلیم صرف میٹرک تھی لیکن میدان سیاست

میں داخل ہونے کے بعد اس زبان کا سیکھنا اس لیے بھی لازم ہو گیا تھا کہ دشمن انگریزی کے سوائے اور کوئی زبان سمجھتا ہی نہ تھا اس لیے انھوں نے بھی انگریزی زبان سیکھنے پر توجہ دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس پر ایسا قابو پایا کہ ایک بار جلسۂ عام میں بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے اردو میں تقریر کی تو بہادر یار جنگ نے اعلان کیا۔

"اگر مسز سروجنی نائیڈو اردو جیسی مشکل زبان میں تقریر کر سکتی ہیں تو کیا بہادر خاں انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر نہیں کر سکتا۔"

ایک واقعہ اور ہے ــــ وہ ایران کے سفر پر روانہ ہوئے۔ تہران میں انھیں کسی مقام تک جانا تھا۔ انھوں نے سڑک پر ایک ٹیکسی روکی اور ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"فلاں مقام تک کا کیا لو گے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

"آپ کتنے آدمی ہیں؟"

بہادر یار جنگ اکیلے تھے لیکن فرمایا۔

"دو"

ٹیکسی ڈرائیور نے فی کس کرایہ بتا دیا تو بہادر یار جنگ نے فرمایا۔

"کرایہ تو ایک ہی شخص کا دوں گا لیکن چلیں گے دو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کیا۔

"میں تو نہیں لے جاؤں گا۔"

نواب صاحب نے اصرار فرمایا۔
"میں اور میرا ساتھی ضرور جائیں گے لیکن کرایہ ایک ہی کا ملے گا۔"
ٹیکسی ڈرائیور کو غصہ آگیا۔ اس نے انھیں لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے ہنس کر فرمایا۔
"بھیا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ کیا خدا کا بھی کرایہ لو گے؟"

بہادر یار جنگ نے اپنی صدائے جگر گداخت سے غلام ہندوستان کی کتنی راتوں کے بھیانک اندھیروں کو پگھلایا ہے کیا اندازہ کیا جائے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بہادر یار جنگ کی نوا ہائے دل گداز سے گونجتی ہوئی ہندوستانی راتیں شہرۂ آفاق الف لیلا سے بھی زیادہ فسوں پرور تھیں۔

بہادر یار جنگ زندگی بھر اپنی آواز کے شعلے سے غلامی کے اندھیروں کو فروزاں کرتے رہے تاکہ ۴۰ کروڑ غلاموں کے لیے آزادی کی جگمگاتی سحر طلوع ہو۔

بہادر یار جنگ کی شوخیٔ طبع نے ایک بار اپنے سحر یعنی اپنی آواز کی آپ یوں مدح فرمائی تھی۔

آگاہ رموز دین فطرت ہوں میں
کچھ مجھ سے سنو لسان الامت ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم
شاہنشہ اقلیم خطابت ہوں میں

بہادر یار جنگ کی شوخیٔ گفتار، صدائے جگر گداخت اور لب معجز بیاں کے ہزار قصیدے ہیں لیکن ان کے سوز نطق کی جو صحیح تعریف میرے دوست خواجہ معین الدین نے ایک ہی جملے میں کی ہے وہ سارے قصیدوں پر بھاری ہے۔ خواجہ معین الدین نے کہا تھا۔

"جب بہادر یار جنگ کی آواز فضا میں بلند ہوتی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہندوستان کے بے عمل مسلمانوں پر قرآن اردو میں نازل ہو رہا ہے۔"

جناب کے۔ ایچ۔ خورشید

بہادر یار جنگ کی وفات اور قائداعظم

جون ۱۹۴۴ء کی ایک صبح کو آل انڈیا ریڈیو نے اپنی خبروں میں نواب بہادر یار جنگ کی وفات کی خبر سنائی۔ خبر میں کہا گیا کہ گذشتہ شام نواب صاحب حیدر آباد دکن میں ایک ضیافت میں مدعو تھے مگر جلد ہی گھر لوٹ آئے اور گھر پہنچتے ہی وفات پا گئے۔

قائداعظم ان دنوں سری نگر میں تھے۔ ڈاکٹروں کی سخت تاکید پر وہ آرام کرنے کے لیے سری نگر آئے ہوئے تھے جہاں وہ سر مراتب علی کے مہمان اور ان کے بجرے "کوئن ایلزبتھ" میں مقیم تھے۔ اس جگہ کے بالمقابل

"آبی گذر" کے مقام پر میرا قیام تھا۔ قائداعظم کی قیام گاہ سے یہ قربت میرے لیے بڑی مفید تھی کیوں کہ ان دنوں اورینٹ پریس آف انڈیا کے اعزازی نامہ نگار کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ سری نگر میں اورینٹ پریس کے مستقل اعزازی نامہ نگار جناب اسماعیل ساغر تھے اور میں ان کی جگہ عارضی طور پر کارگذار تھا اورینٹ پریس ان دنوں ہندوستان کا واحد خبر رساں ادارہ تھا اور اس دور کے دوسرے مسلم اداروں کی طرح اس کے کارکن بھی اعزازی طور پر کام کرتے تھے۔

دلی کے انگریزی روزنامے اسٹیٹسمین کے الفاظ میں قائداعظم سیاسی لیڈروں کی طرح "میاں باز" سیاستداں نہیں تھے۔ صحافی جانتے تھے کہ اُن سے بیانات حاصل کرنا بڑا مشکل کام ہے اور بہت ہی کم مواقع ایسے آتے تھے کہ قائداعظم کوئی اخباری بیان جاری کریں۔

بہادر یار جنگ کی وفات کی خبر سُنتے ہی قائداعظم کے بجرے پر پہنچا۔ اُن کے گوانی ملازم نے بتلایا کہ قائداعظم ابھی ناشتے کے لیے بیٹھے ہیں مجھے کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔

قائداعظم ملک خضر حیات خاں ٹوانہ سے اختلاف کے بعد سے ہی سری نگر میں مقیم تھے۔ اس قیام کا کچھ عرصہ انھوں نے سر مراتب علی کے مکان "کشک" میں گذارا جو چشمۂ شاہی کے قریب تھا۔ چشمۂ شاہی وہی جگہ ہے جہاں سے مغل شہزادے دارا شکوہ کو بڑی محبت تھی۔ "کشک" کے بعد قائداعظم جناب مراتب علی کے بجرے "کوئن ایلزبتھ" میں منتقل ہو گئے تھے سر مراتب علی تحریک پاکستان کے ایک پُرجوش حامی تھے۔ ان کے دونوں فرزند

سید واجد علی اور سید ماہر علی بھی والد کی طرح قائداعظم کے پرستار تھے۔
یہ پُرآشوب دور تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ جاری تھی۔ اِدھر ہندوستان میں مسٹر گاندھی جیل سے رہا ہو چکے تھے اور ملک میں افواہوں کا بازار گرم تھا۔ سری نگر ملک کی تقسیم سے پہلے بڑا ہی پُرسکون شہر تھا۔ لاہور کے اخبار یہاں دوسرے دن آتے تھے اور دلّی کے تیسرے دن۔ ریڈیو کی خبریں جنگی پروپگنڈے سے بھری ہوتی تھیں۔ کسی خبر رساں ایجنسی کا دفتر بھی وہاں نہ تھا۔ ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا کی نمائندگی ایک سرکاری ملازم کرتے تھے۔

اُن دنوں میں جب بھی قائداعظم سے ملتا وہ مجھ سے مسٹر گاندھی کی مصروفیات کے متعلق خبریں پوچھتے۔ میری معلومات کا ذریعہ بھی اخبار ہی ہوتے۔ اس لیے میں قائداعظم کو کوئی مفید اطلاع نہ پہنچا سکتا کیوں کہ وہ خود نہایت توجہ سے سارے اخبار پڑھتے بلکہ اشتہار تک نہ چھوڑتے مسلم لیگ کی طرح کانگریس کا بھی ریاست میں کوئی دفتر نہ تھا۔ جہاں سے کوئی اہم خبر حاصل ہو سکتی۔ میں قائداعظم سے ملاقات کا منتظر تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج ہماری گفتگو میں مسٹر گاندھی کا ذکر نہ آئے گا۔

تھوڑی ہی دیر میں قائداعظم اس کمرے میں تشریف لے آئے۔ جہاں میں بیٹھا تھا۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ قائداعظم نے ریڈیو کی خبریں نہیں سُنی تھیں میں نے قائداعظم کو یہ افسوسناک خبر سنائی۔

قائداعظم خاموش رہے اور ان کے سکوت نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ علی الصبح ایسی خبر سنانا میرے لیے مناسب بھی تھا یا نہیں

میں اسی ذہنی کش مکش میں تھا کہ قائداعظم اچانک بولے۔
"مجھے اس خبر پر یقین نہیں آتا۔"
میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ میں نے پھر ایک مرتبہ آل انڈیا ریڈیو کی خبر دہرا دی۔
قائداعظم نے فرمایا۔
"میرے عزیز! آل انڈیا ریڈیو نے ایک مرتبہ میری موت کی خبر بھی نشر کی تھی۔"
میں لاجواب ہو گیا اور واپس ہونے ہی کو تھا کہ مس فاطمہ جناح آپہنچیں۔ یہ خبر انھیں بھی سنائی گئی مجھے امید بندھی کہ شاید محترمہ فاطمہ جناح اس خبر کو صحیح مان لیں۔ انھوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کر دی۔
"نواب صاحب کل شام کو کہاں تھے۔" "ان کی وفات کہاں ہوئی۔" "اگر وہ کسی ریاست میں گئے تھے تو کچھ کھایا بھی تھا یا نہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ مگر میری معلومات آل انڈیا ریڈیو کی مختصر خبر تک محدود تھیں میں سمجھ گیا کہ قائداعظم مجھے کوئی تعزیتی بیان نہیں دیں گے۔
میری تمنا تھی کہ قائداعظم کا تعزیتی بیان سب سے پہلے میں حاصل کروں اور دوسری خبر رساں ایجنسیوں پر سبقت حاصل کر لوں۔ شاید قائداعظم کو میری ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو گیا اور انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر خبر کی تصدیق ہو گئی تو ضرور تعزیتی بیان دیں گے اور مجھ ہی کو دیں گے۔
قائداعظم کی یقین دہانی کے باوجود میرے شبہات باقی رہے [illegible]

دیر بعد پھر قائداعظم سے ملوں گا۔

چنانچہ تھوڑی بعد چند دیگر احباب کے ساتھ جو قائداعظم سے ملاقات کرنا چاہتے تھے بجرے پر پہنچا۔

جب ہم نشست کے کمرے میں پہنچے تو وہاں کی فضا دیکھ کر یقین ہوگیا کہ اس خبر کی تصدیق ہو چکی ہے۔ قائداعظم بے حد سنجیدہ نظر آتے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے چہرے سے بھی غم نمایاں تھا۔ اس وقت تک اتحاد المسلمین، ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا، اور رینٹ پریس، حیدرآباد دکن اور اسٹیٹس مسلم لیگ کے ٹیلیگرام قائداعظم تک پہنچ چکے تھے۔

قائداعظم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اسٹیٹس مسلم لیگ ختم ہوگئی" پھر انھوں نے اپنے سکریٹری کو ہدایت کی کہ تعزیتی بیان میرے حوالے کر دیں۔ اور اس دن مسٹر گاندھی کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا۔

تمت